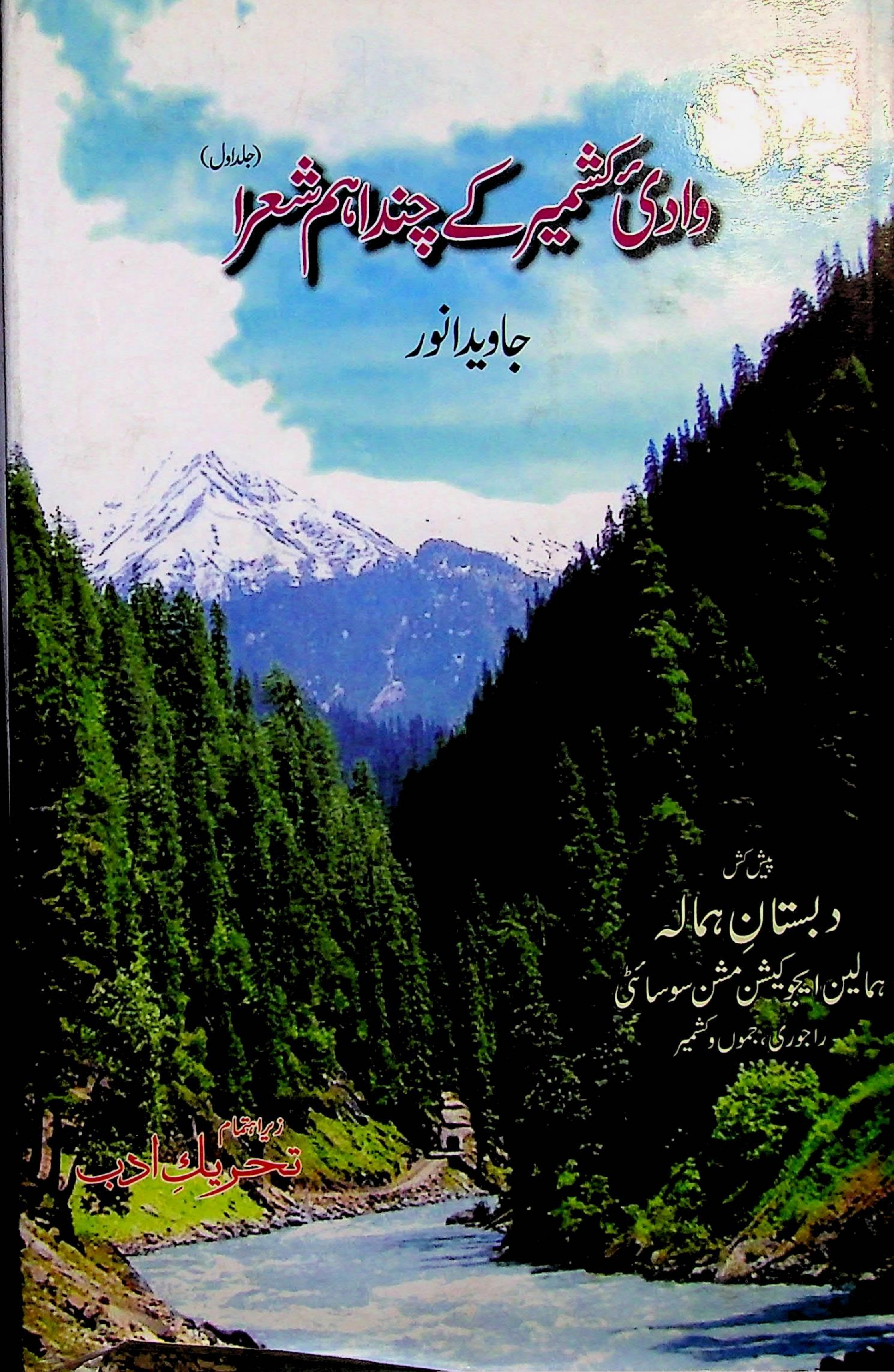

(جلد اول)
وادیٔ کشمیر کے چند اہم شعرا
جاوید انور
پیش کش
دبستانِ ہمالہ
ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی
راجوری، جموں و کشمیر
زیر اہتمام
تحریکِ ادب

محترم جناب سلیم سالک صاحب کی خدمت میں
بصد خلوص و احترام
جاوید انور
۲۵ جولائی ۲۰۱۳
سرینگر

وادیٔ کشمیر کے چند اہم شعرا (جلد اول)

(مضامین)

جاوید انور

نام کتاب: وادیٔ کشمیر کے چند اہم شعرا (جلد اول)

مصنف: جاوید انور

Wadi-e-Kashmir ke Chand Aham Shoára

by Jawed Anwar

Price 300/- only

پتہ: اردو آشیانہ، ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ
منڈواڈیہہ بازار، وارانسی

ضخامت: ۲۸۸ صفحات

طباعت: مہاویر پریس، وارانسی

کمپوزنگ وسرورق: عظمیٰ اسکرین، وارانسی Mob.: 9369138837
e-mail: uzmascreen_vns@yahoo.com

سن اشاعت: ۲۰۱۲ء

تعداد: ۵۰۰

قیمت: ۳۰۰/روپے

تقسیم کار:

Asr Book Depot, Main Bazar, Rajouri
Cell : 09419172781
Parvez Manoos, 115, Azad Basti, Nattipora, Srinagar
Cell : 09419463487
Jawed Anwar, Urdu Ashiana, 167 Afaq Khan ka Ahata
Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 Cell : 09935957330

پیش کش

دبستانِ ہمالہ

ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی

راجوری، جموں و کشمیر

Himalayan Education Mission Society

Rajouri, Jammu-185131 J&K

Contact: 09419170902, 09419184689, 09797316229

e-mail : himalayan517@rediffmail.com

نام کتاب: وادیٔ کشمیر کے چند اہم شعرا (جلد اول)

مصنف: جاوید انور

Wadi-e-Kashmir ke Chand Aham Shoára

by Jawed Anwar

Price 300/- only

پتہ: اردو آشیانہ، ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ
منڈواڈیہہ بازار، وارانسی

ضخامت: ۲۸۸ صفحات

طباعت: مہاویر پریس، وارانسی

کمپوزنگ و سرورق: عظمیٰ اسکرین، وارانسی Mob.: 9369138837
e-mail: uzmascreen_vns@yahoo.com

سن اشاعت: ۲۰۱۲ء

تعداد: ۵۰۰

قیمت: ۳۰۰/روپے

تقسیم کار:

Asr Book Depot, Main Bazar, Rajouri
Cell : 09419172781
Parvez Manoos, 115, Azad Basti, Nattipora, Srinagar
Cell : 09419463487
Jawed Anwar, Urdu Ashiana, 167 Afaq Khan ka Ahata
Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 Cell : 09935957330

پیش کش

دبستانِ ہمالہ

ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی

راجوری، جموں وکشمیر

Himalayan Education Mission Society

Rajouri, Jammu-185131 J&K

Contact: 09419170902, 09419184689, 09797316229

e-mail : himalayan517@rediffmail.com

انتساب

ابا

منصور احمد

اور

اماں

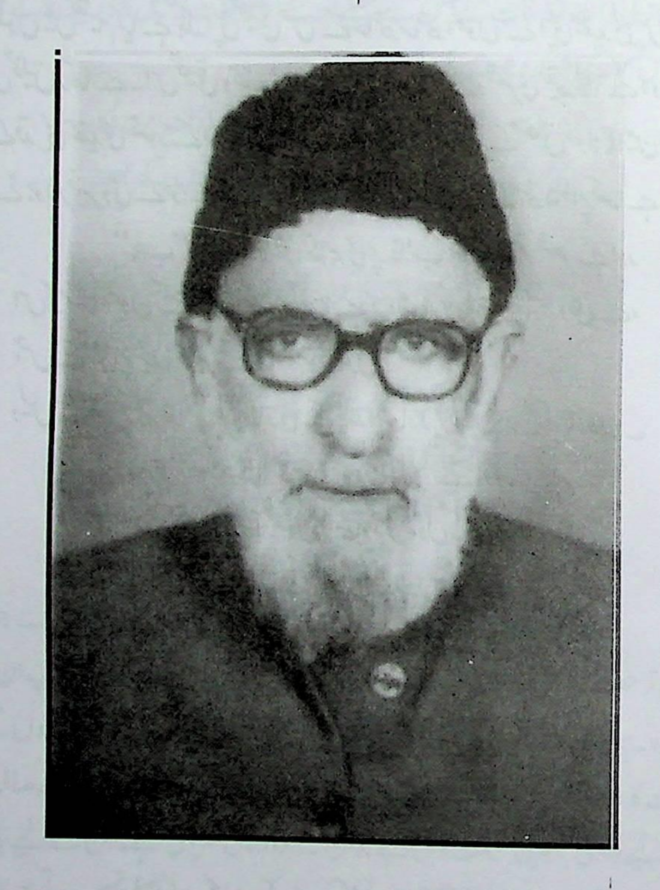
زاہد النساء

کے نام

جن کی رضا اور دعائیں جنت کا دروازہ اور کنجی ہیں۔

فہرست

میر غلام رسول نازکی



میر غلام رسول نازکی کے شعری افکار

میر غلام رسول نازکی کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے اشعار میں مضمر تنقیدی شعور کے احساسات بخوبی نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری کو فنی طور پر مختلف قسموں میں تقسیم کیا ہے بلکہ اپنی تخلیقی حس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی تنقیدی حس کو بہ یک وقت شامل تخلیق رکھا ہے۔ اس تخلیقی و تنقیدی حسیات کے ادغام کا جو شعری نتیجہ نکلا ہے، وہ سنسکرت شاعری کے قدیمی تنقیدی تصور کے اس ایک عنصر سے جاملتا ہے، جس کے متعلق مولانا امین احمد عباسی جڑیا کوٹی نے جواہر خسروی کے حوالے سے مقدمہ خالق باری جلد اول کے صفحہ ۱۲۵ پر لکھا ہے۔

> "جب معنی پوشیدہ معنی ظاہری پر غالب ہو تو وہ اتم شعر ہے اور اس کو ممکما دھون کہتے ہیں۔ گوبند لکھتا ہے کہ اشعار کی بہترین قسم وہی ہے، جس کے معنی پوشیدہ ظاہر سے زیادہ موثر ہوں۔"

دلیل کے طور پر میر غلام رسول نازکی کے چند اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔

رہرو راہ محبت ہے ابھی منزل سے دور
منزل مقصود ہے آنکھوں سے اوجھل، دل سے دور

یا الٰہی ہو تمہارے آسماں والوں کی خیر
آدم خاکی نہیں ہے اب مہ کامل سے دور

خواب عدم سے جاگنے والوں کی بے بسی
آنکھیں ہی مل رہے تھے کہ پھر رات ہوگئی

دل سکوں محسوس کرتا ہے کئی سالوں کے بعد
زندگی معمول پر آئی ہے ہڑتالوں کے بعد

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے، ان میں باطنی معنی کی کئی تہیں موجود ہیں اور یہ مختلف نقطۂ نظر سے میر غلام رسول نازکی کے جذبات کے غالب اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جہاں یہ جذبات

جسمانی طور پر دنیا کے مختلف مسائل سے منسلک ہیں وہیں روحانی سطح پر ان کا تعلق اپنی سرزمین کشمیر سے شدید تر ہے۔ کشمیر میں جاری کشت وخوں ایک ایسا المیہ ہے، جس سے وادیٔ کشمیر اور اس سے باہر کا بھی فن کار کسی نہ کسی طور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اور جس کا سامنا روزمرہ کے ان حالات سے ایسا ہو کہ معمولات زندگی کا ایک کرب ناک حصہ بن گئے ہوں، اس کے ذہن ودل پر اس کا کیا اثر ہوگا، بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک وجہ ہے کہ وادیٔ کشمیر کے تمام فن کاروں کے یہاں وادی کا یہ کرب تند وسبک لہجے میں ان کی تخلیقی ذات کا ایک اہم جزو بن کر ابھرا ہے۔ اس اہم جزو کے آئینے میں میر غلام نازکی ذات وکائنات کے تعلق سے پھیلے ہوئے موضوعات کو تخلیق کا ذریعہ بناتے ہیں تو ان کی قلم سے اس قسم کے اشعار وجود میں آتے ہیں۔

اس زمانے کے رئیسوں کی معارف پروری
شاعروں پر بھی کرم ہوتا ہے، قوالوں کے بعد

جبین ناز کو آلودۂ ملال نہ کر
میں بے ادب ہوں، مری بات کا خیال نہ کر
خدا بھی تجھ سے جو پوچھے تری رضا کیا ہے
قلندری کا تقاضا ہے، عرض حال نہ کر
ترا مقام مقام رضا سے آگے ہے
خودی نہ بیچ طفیلی نہ بن، سوال نہ کر

میر غلام رسول نازکی کی قسمت میں کشمیر کے یہ حالات اسی وقت آئے جب وہ اپنی عمر کا بیش تر حصہ اس جنت نشاں کی بہاروں کی نذر کر چکے تھے۔ اس لیے ان کا کرب ان نوجوانوں سے زیادہ ہے جنھیں وہ بہاریں دیکھنی نصیب ہی نہ ہوئیں۔ اور اس طرح ماضی کی یادوں کے ان خوش گوار لمحات کا دور حاضر کے حالات سے موازنہ ان کی تقدیر نہ بن سکا اور وہ اس سے صاف بچ گئے۔ ان کے لیے وادیٔ کشمیر کی حقیقت وہی ہے جو ان کے دور میں نظر آتی ہے۔ ان کے لیے یاد ماضی سنی سنائی باتیں ہیں جن سے صدمہ تو پہنچتا ہے، لیکن کرب کی وہ لذت حاصل نہیں ہوتی جو اس دور میں اپنی زندگی کا بیش تر حصہ گزار دینے والے مشاہد کو حاصل ہوتی ہے۔

میر غلام رسول نازکی کو یہ لذت حاصل ہے اس لیے یاد ماضی کی خوش گوار بہاروں سے لے کر زندگی کے المیے تک کے آئینے میں پوری دنیا میں ہو رہی زندگی کی دوسری تبدیلیوں کو دیکھنے کا

رجحان ان کے یہاں ملتا ہے۔ یہ رجحان کہیں تمثیلی جہت میں تو کہیں علامتی جہت میں موجود ہے۔ جو ہاں (Johan Huizinga) نے تمثیل اور علامت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کسی خیال کو حقیقی وجود دینے کے بعد دماغ اس خیال کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے اور ایسا اس کو مجسم کر کے ہی ہوسکتا ہے۔ اس طرح تمثیل وجود میں آتی ہے۔ یہ (عمل) علامت کا سا نہیں ہے۔ علامت دو تخیلوں کے درمیان ایک پراسرار تعلق کو ظاہر کرتی ہے اور تمثیل ایسے تعلق کے تصور کو مرئی ہیئت عطا کرتی ہے۔ علامت نگاری ذہن کا گہرا عمل ہے اور تمثیل (اس کی یہ نسبت) سطحی۔''

(The waining of the Middle Ages, Johan Huizinga J.R.F. Hopman, New York 1954, P. 205)

زمانہ ایک مسلسل عمل ہے لا محدود
بلا سبب اسے پابند ماہ و سال نہ کر

زنداں کے بام و در کی حفاظت کے واسطے
نقش و نگارِ تاج محل بیچتا ہوں میں

آج اس شہر پہ نازل ہے خداؤں کا عتاب
تو بھی اس شہر کا باسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
آسماں بر سر پیکار ہے، نظریں نہ چرا
یہ زمیں خون کی پیاسی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ

از بسکہ چمن زاروں میں پلا، صحرا میں اگا، جنگل میں بڑھا
اس قد کے برابر سرو سہی، شمشاد صنوبر ہو نہ سکا

مندرجہ بالا اشعار سے ظاہر ہے کہ ان میں وحدت، ستھرا پن اور صحت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ میر غلام رسول نازکی نے اپنی شعری زبان کے استعمالات میں فطرت اور خود کار عمل یعنی غیر شعوری عمل سے زیادہ کام لیا ہے۔ ان کے یہاں لفظ اپنے الگ سیاق میں بھی ایک مخصوص تصور کی نمائندگی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ بعض شعری سطحوں پر یہ تصور شعر کی افہام و تفہیم کا فرض بھی ادا کرتا

ہے۔ان کے اشعار سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد میں ہو رہی دور رس تبدیلیوں کی پیچیدگیوں کو اپنے تخیل کے ایک اہم عنصر کے طور پر اپنے شعروں میں برتا ہے۔لسانی اعتبار سے دیکھا جائے تو کشمیری زبان کا لہجہ اور آہنگ اور اس کی مقامی نوعیت نے ان کے اردو لب و لہجہ اور شعری نوعیت کو موضوعاتی سطح کے علاوہ دوسری نوعیتوں سے متاثر نہیں کیا ہے جیسا کہ ان کے ذیل میں درج اشعار سے بھی واضح ہے۔

جہان سوز و ساز میں نہ پوچھ لذت فراق
وصال گو لذیز ہے، فراق کا بدل نہیں

جل کر ہوئی ہے مٹی، محفل میں شمع محفل
پروانہ لے کے نکلا، پروانہ زندگی کا

دل ڈٹ کے مقابل ہے آلام مصائب سے
گویا کہ چٹانوں سے لہروں کا تصادم ہے

یہاں چارہ گر سوچتا ہے مداوا
وہاں درد و درماں میں باہم ٹھنی ہے

میر غلام رسول نازکی کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی روایت کی نفاست اور رنگارنگی کافی حد تک ان کے تخیل میں جذب ہو چکی ہے۔لیکن ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے فارسی اصطلاحات کو باعث افتخار محسوس کیا ہو اور دیگر اردو اصطلاحات یا الفاظ جو کہ دیگر زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئے، کو بے اعتنائی اور بے قدری یا کم قدری کے آئینے میں دیکھا اور برتا ہو۔فارسی الفاظ و تراکیب سے ان کا شغف نمایاں ہے لیکن دیگر الفاظ سے بھی انھوں نے اپنی شاعری میں جو کام لیا ہے، وہ جہاں ان کی قادر الکلامی کے ثبوت فراہم کرتا ہے، وہیں لفظوں کو برتنے کے اعتبار سے کسی تعصب کو بھی خارج کرتا ہے۔

ہر شے کی حضوری میں جھکوا دیا سر میرا
اے ذوق جبیں سائی! اے لذت رسوائی

عشق والوں سے نہیں، نام کے دیوانوں سے
کھا گئے اہل خرد مات، خدا خیر کرے

جب انا الحق کہنے والے لوگ ہی رخصت ہوئے
پھر زباں پر قصہ دار و رسن کب آئے گا

اب تو دن گھٹنے لگا، سائے بھی لمبے ہو گئے
ہم بھی گھر جائیں گے، اپنے اپنے گھر جاتے ہیں لوگ

میر غلام رسول نازکی نے اپنے دور کی اردو کی مروجہ روایت میں اپنے تخلیقی شعور کے عمدہ نمونے تو پیش کیے ہی ہیں، نئے فکری اور جمالیاتی میدانوں کی جانب بھی قدم بڑھائے ہیں۔ یہ پہلو غزل کے علاوہ بھی انھوں نے جس نثریہ اور نظمیہ صنف میں طبع آزمائی کی ہے، نظر آتا ہے۔ ان کی اس قسم کی مختلف پیش کش غزلیہ شاعری کو موضوعی وحدت کے قریب کر دیتی ہے جو اپنی دیگر خصوصیات کے ساتھ غزل میں تنوع کی دوسری راہیں ہموار کرتی ہیں۔ ان کے یہاں انسانی فطرت کو حقیقت کے طور پر برتنے کا رجحان موجود ہے۔

انھوں نے سماجی، مادری اور تاریخی تصورات کو جدید مفاہیم کے ساتھ اس طور بھی برتا ہے کہ ان کے ماضی اور حال کے امتیازات جذبہ وخیال کی آمیزش میں تقریباً گم ہو گئے ہیں۔ اس طرح ایک الگ طرح کا رچاؤ ان کے یہاں نظر آتا ہے۔

کوئی افسانہ نہ سنا، الفاظ کا جادو جگا
کام کی باتیں نہ کر، اس سے بپھر جاتے ہیں لوگ
سرزمین دل بھی ہوتی کاش جولاں گاہ عشق
زہرو مریخ پر یوں تو اتر جاتے ہیں لوگ
موت دیتی ہے کشمکش سے نجات
موت مجبور کا سہارا ہے
ایک جان ناتواں اور اتنے سارے مرحلے
اتنے سارے مرحلوں سے بھی گزر جاتے ہیں لوگ

میر غلام رسول نازکی نے جس طرح اردو خدمات کے اپنے مختلف رویوں کے ساتھ کشت ادب کی آبیاری کی ہے، وادیٔ کشمیر میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اپنے تخلیقی اثاثے کی بنیاد پر اور اردو خدمات کے اعتراف کے طور پر اہل ادب کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

نمونۂ کلام

دل سکوں محسوس کرتا ہے کئی سالوں کے بعد
زندگی معمول پر آئی ہے ہڑتالوں کے بعد

قبر کی پہلی ہی شب کتنی نشاط انگیز تھی
خوب اطمینان تھا دنیا کے جنجالوں کے بعد

اس زمانے کے رئیسوں کی معارف پروری
شاعروں پر بھی کرم ہوتا ہے، قوالوں کے بعد

ہر کلی میں حسن، ہر گلشن حسین، ہر گل جمیل
اس چمن کا حال کیا ہوگا، چمن والوں کے بعد

میرے کل اعمال نامے سے فرشتوں کو ملیں
ایک دو خرمستیاں، دس بیس ہڑتالوں کے بعد

جبین ناز کو آلودۂ ملال نہ کر
میں بے ادب ہوں، میری بات کا خیال نہ کر
مچل نہ جائے کہیں یہ دل فراق پسند
خدا کے واسطے آرائش جمال نہ کر
فراق نے اسے بخشی ہے زندگی کی تڑپ
دل ستم زدہ کو خوگر وصال نہ کر
خدا بھی تجھ سے جو پوچھے تری رضا کیا ہے
قلندری کا تقاضا ہے عرض حال نہ کر
ترا مقام مقام رضا سے آگے ہے
خودی نہ بیچ طفیلی نہ بن، سوال نہ کر
زمان ایک مسلسل عمل ہے لا محدود
بلا سبب اسے پابند ماہ وسال نہ کر

آج حد درجہ اداسی ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
التجا ایک ذرا سی ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
آج کی رات بھیانک ہے مرے ساتھ رہو
اور قیامت بھی بپا سی ہے مرا ساتھ نہ چھوڑ
آج اس شہر پہ نازل ہے خداؤں کا عتاب
تو بھی اس شہر کا باسی ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
آسماں بر سر پیکار ہے نظریں نہ چرا
یہ زمیں خوں کی پیاسی ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
میں اکیلا ہوں سمندر کا تلاطم ہے محیط
رات اک کالی بلا سی ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ
کربلا آج بھی ہے دیکھ ادھر خون حسین
وہ محمد ﷺ کا نواسہ ہے، مرا ساتھ نہ چھوڑ

ادا شناس بن، یہاں قیاس کا محل نہیں
جنوں اساس عقل ہے، دماغ کا خلل نہیں
خدادلوں سے دور ہے، مہیب و ناصبور ہے
یہ مولوی کا فلسفہ نوشتۂ ازل نہیں
جہان سوز و ساز میں نہ پوچھ لذتِ فراق
وصال گولزیز ہے، فراق کا بدل نہیں
غرورِ حسن ناروا کہ حسن بے ثبات ہے
خلاف طبع ہو تو ہو، یہ بات بے محل نہیں

ساقی کی مست آنکھیں خم خانہ زندگی کا
چشم سیہ کی گردش پیمانہ زندگی کا
جل کر ہوئی ہے مٹی، محفل میں شمع محفل
پروانہ لے کے نکلا، پروانہ زندگی کا
افکار زندگی کا شیرازہ منتشر ہے
اب تک ہے نامکمل افسانہ زندگی کا
دو دن کی زندگانی، سو سال کے ارادے
دیوانہ ہو گیا ہے، دیوانہ زندگی کا

محبوب کے ہونٹوں پر سیلاب تبسم ہے
یا نور کے دریا کی موجوں میں تلاطم ہے
اب خوب گذرتی ہے، انجام خدا جانے
ہر سانس میں نغمہ ہے، ہر لے میں ترنم ہے
دل ڈٹ کے مقابل ہے آلام مصائب سے
گویا کہ چٹانوں سے لہروں کا تصادم ہے
دنیائے محبت کی ہر چیز نرالی ہے
خاموش اشاروں پر بنیاد تکلم ہے
جب جنت ارضی میں آرام نہیں ملتا
پھر خلد بریں کیا ہے، واعظ کا تو ہم ہے

بدن مرتعش روح میں سنسنی ہے
اجل کے فرشتوں! یہی جاں کنی ہے
مجھے بے طلب زندگی دینے والے
یہ احسان تیرا نہیں، دشمنی ہے
یہاں چارہ گر سوچتا ہے مداوا
وہاں درد و درماں میں باہم ٹھنی ہے
بگڑتی ہے بن بن کے قسمت ہماری
نہ کل تک بنے گی نہ اب تک بنی ہے
وہاں زاہد خشک کو کیا ملے گا؟
سزاوار رحمت تو تر دامنی ہے
مجھے تم سے یارب شکایت یہی ہے
یہاں فقر کے بھیس میں رہزنی ہے
کہاں میں کہاں نغمۂ زندگانی
مرے روپ میں جلوہ فرما غنی ہے

اس شوخ کو کیا دیکھا آنکھوں میں سمٹ آئی
شیراز کی شادابی، کشمیر کی رعنائی
رہ رہ کے مرے دل میں اک درد سا اٹھتا ہے
آ اپنے لبوں سے دے پیغام مسیحائی
ہر شے کی حضوری میں جھکوا دیا سر میرا
اے ذوق جبیں سائی! اے لذت رسوائی
شرمندۂ الفت ہوں، سودائے محبت ہوں
دامن میں چھپا مجھ کو، اے گوشۂ تنہائی
سوکھا ہوا سبزہ ہوں گلزار محبت کا
کب سایہ فگن ہوگا وہ سرو دل آرائی

گل بداماں، گل بکف، گل پیرہن کب آئے گا
وہ سراپا رونق صحن چمن کب آئے گا
انجمن کی انجمن سونی پڑی ہے ہر طرف
سوچتا ہوں وہ فروغ انجمن کب آئے گا
ہم مصور بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، دانشور بھی ہیں
کوئی بتلا دو ہمیں جینے کا فن کب آئے گا
زندگانی ہے قصیدہ یا رجز یا مرثیہ
دوستو! اس میں غزل کا بانکپن کب آئے گا
بن رہا ہے تانا بانا اک نئی تہذیب کا
اس میں حسن صورت گنگ و جمن کب آئے گا
آدمی کرنے لگے گا احترام آدمی
ہاتھ یہ سرمایۂ عہد کہن کب آئے گا
جب انا الحق کہنے والے لوگ ہی رخصت ہوئے
پھر زباں پر قصۂ دار و رسن کب آئے گا

موت کا جب نام سنتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں لوگ
تم نے دیکھا، ہم نے دیکھا پھر بھی مر جاتے ہیں لوگ

اب تو دن گھٹنے لگا، سائے بھی لمبے ہوگئے
ہم بھی گھر جائیں گے اپنے اپنے گھر جاتے ہیں لوگ

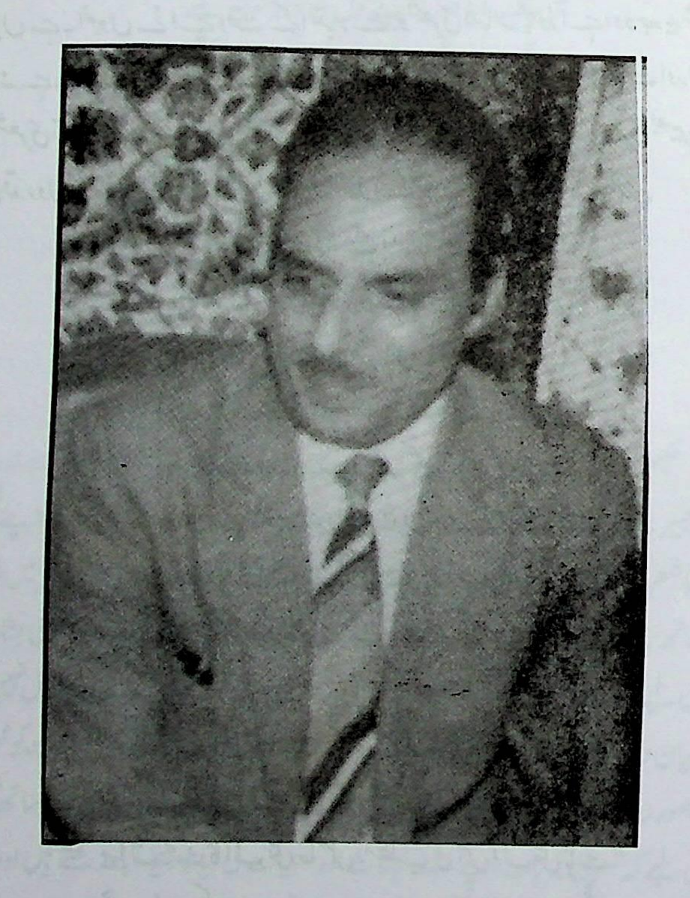
کوئی افسانہ سنا الفاظ کا جادو جگا
کام کی باتیں نہ کر اس سے بپھر جاتے ہیں لوگ

ایک جان ناتواں اور اتنے سارے مرحلے
اتنے سارے مرحلوں سے بھی گذر جاتے ہیں لوگ

سرزمین دل بھی ہوتی کاش جولاں گاہ عشق
زہرہ و مریخ پر یوں تو اتر جاتے ہیں لوگ

حق سے ناوابستگی کے باوجود اس شہر میں
کیوں اناالحق کہتے اور بے موت مر جاتے ہیں لوگ

حکیم منظور



اپنی شرطوں پر سفر کرنے والا۔ حکیم منظور

حکیم منظور کے اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے حالات کی تعبیر اور اس کی ترجمانی کے لیے جن رمز و علامات اور اشاروں کا استعمال کیا ہے، ان میں کثیر العلمیت پورے طور نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنے وقت کے اعتبار سے جو شعری اساسہ چھوڑا ہے، وہ جدید شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ انہوں نے اپنے شعری بیان کو تبصرے کی شکل نہیں دی بلکہ اپنی حسیات اور اس سے منسلک شعری تقاضوں سے معاشرتی رشتوں کو ظاہر کرنے کی ضمن میں اپنی مخصوص شعری بصیرت کو کبھی ماضی کی قدروں کے طور پر اور کبھی حال کی ذہنی الجھنوں کے طور پر برتا ہے۔ چند اشعار۔

وہ مسافت، راستوں کے راستے سوئے لگے
وہ سماعت، پھول لفظوں کے بدن دکھنے لگے
وہ قیادت، سامنے کی رہ بھی ہاتھ آئی نہیں
وہ مسافت، بے قدم اپنے قدم لگنے لگے
وہ عبارت، جو سر دیوار تھی لکھی ہوئی
وہ تلاوت، چشم اندر چشم خواں رونے لگے
وہ صداقت، آسماں تختی پہ جو کندہ ہوئی
وہ وضاحت، کچھ نہ سمجھے تھے مگر سمجھے لگے

گویا حرف کی صورت شبنم، حرف گل پر لکھتی ہے
وہ لمحوں کی دلجوئی، پھر سب کا اپنا اپنا غم
ہر اک بحث کا اک ہی حاصل، مطلب کی بس اک ہی بات
جس کا پیکر اس کا سایا، سائے کا ہم سایہ غم

حکیم منظور نے اپنی شاعری میں زبان اور وقت کے تصور کو منسلک کرنے کے لیے عام بول چال کے الفاظ پر بھی نظر کی ہے۔ انہوں نے روایتی آہنگ کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے فطری

جدید تقاضوں کو سنجیدگی کے ساتھ اپنے اشعار کا حصہ بنایا ہے۔ لیکن اس کے لیے انہوں نے غیر مذہبیت یا لامذہبیت کے تصور کو نہیں اپنایا ہے بلکہ اپنے شعری عقیدے جس کے توسط سے وہ اپنی تخلیق کے پورے وجود کو معنی و مقصد دے سکیں، کا سہارا لیا ہے۔ ان کا شعری عقیدہ مذہب کے کسی فلسفے سے نہیں ٹکراتا بلکہ خالص ادبی خیال اور اگر ان میں مثبت مذہبی پہلوؤں کا کوئی عنصر شامل ہو جائے تو وہ شعری حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔

شفق بدن، بے قرار، پر لمس خواہشوں سے
میں تنگ آیا ہوں اپنے دل کی نوازشوں سے
عبادتیں اس کی میرے کام آسکیں نہ لیکن
اسے ملا ایک راستہ میری لغزشوں سے

ان درختوں پر بہت پھل تھے کبھی
ہاتھ موسم کے اگر شل تھے کبھی
ایسے منظر بھی ہوئے ہیں بے لباس
آپ خود سے بھی جو اوجھل تھے کبھی

حکیم منظور نے اپنے تجربات میں نئی ذہنی رو کو عام کیا ہے جو بدلتے ہوئے حالات اور اس کی تشریح و تعبیر سے وجود میں آتی ہے۔ اور ایک دنیا اس سے متاثر ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے شخصی لہجے میں ایسا شعری منظر نامہ خلق کیا ہے جو پڑھنے والے سے سمجھنے، غور کرنے اور اس ذہنی سفر میں شاعر کے ساتھ ساتھ چلنے کی دعوت دیتا ہے اور اس طرح اس کی بالیدگی ذہن کے مزید استحکام کی بشارت بھی۔ یہ اس لیے ممکن ہو سکا ہے کہ حکیم منظور نے اپنی شاعری کو ان مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا ہے جس کا بیان دوسری کسی ہیئت میں زیادہ کامیاب اور موثر ہو بلکہ ان کا اختصار بحر دخیالات کو شعری تجربات کی صورت میں پیش کرنے کا ہنر ہے۔ اس کے لیے واضح بیانیہ انداز بہت دور تک ساتھ نہیں دیتے۔ اس لیے کہ شعری تجربات اپنے اندر خیالات اور معنیات کی ایک دنیا آباد رکھتے ہیں اور جن اشاروں سے اس دنیا کا سراغ لگایا جا سکتا ہے، وہ علامت اور استعاروں میں موجود ہیں۔ یہ علامتیں اور استعارے حکیم منظور کے اشعار میں ایسی وحدت اختیار کرتے ہیں جو زندگی اور اس کے قوی شعور کو سمجھنے اور سمجھانے میں بہت معاون ہیں۔

ہر قدم، ہر راستے کو معتبر کرتے رہے
اپنی ہی شرطوں پہ ہم اپنا سفر کرتے رہے
فاصلے! بس گھومتے رہنے سے طے ہوتے نہیں
سب کو یہ معلوم تھا، دعویٰ دگر کرتے رہے

دستار زمیں بوس مگر سر ہیں سلامت
اس نوع کے جتنے بھی ہیں، منظر ہیں سلامت
منظور نہیں ہے تو، فقط دشمن خوش ذوق
ورنہ ابھی میدان میں لشکر ہیں سلامت

موسم آزاد اگر ہو بھی تو کیا ہو ہم سے
اس نے ہر فصل میں ترتیب کا چکر رکھا

حکیم منظور نے اپنے شاعرانہ خیالات میں جو سیاسی، سماجی اور فلسفیانہ عناصر شامل کیے ہیں، وہ دراصل جدید ماحول کے خاص اور عام دونوں طبقوں کے محسوسات ہیں۔ انہوں نے موجودہ زندگی اور معاشرے کے مختلف اور متضاد پہلوؤں میں مماثلت تلاش کرتے ہوئے مختلف جذبات میں وحدت قائم کرنے کی جو سعی کی ہے وہ صحت اور سادگی کے ساتھ اپنی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتے ہیں۔ زندگی کی پستی کے بنیادی عناصر میں خلوص اور دیانت کی جس کمی کا ذکر ہوتا ہے، تخلیق کار اس کی شدت کو حد درجہ محسوس کرتا ہے۔ اس تعلق سے سلسلۂ خیالات کا ہجوم بعض اوقات اسے تنہائی سے بھی دوچار کرتا ہے۔ اور اس کی تنہائی کا عکس سلسلۂ خیالات میں مزید ایک خیال کا اضافہ کر کے شعری کائنات کو مزید وسعت دیتا ہے۔ حکیم منظور نے اپنے باطن کی پیچیدگیوں کو جو کہ بیش تر سماجی گروہ بندی اور مذہب و روایت سے ان کے کمزور ہوتے رشتوں کی عطا کردہ ہیں، اپنے اشعار میں اس طرح بیان کی ہیں کہ گرد و پیش کی دنیا کا آئینہ بھی محسوس ہوتی ہیں۔

افسانہ ان کے خون میں شامل ازل سے ہے
لوگوں کو روز کوئی نئی بات چاہیے

جب سماعت زار ہوں باسی، قلم بوسیدہ ہوں
چاہے کتنا ہو سخن عالی نسب کس صف میں ہو؟

جب نہ استدلال نے منطق سے قائل ہوں فریق
صبر کی صف کیا رہے، دست غضب کس صف میں ہو!

کچھ تو سورج نے بھی اپنی بند مٹھی وا نہ کی
بند کچھ ہم پر بھی اپنے دل کے دروازے رہے

خوں برف، ہاتھ سرد، نگاہیں تمام خون
میدان بے حریف کا لشکر اداس ہے

حکیم منظور نے اپنے معاشرے کی حقیقتوں کو اس قدر صفائی سے پیش کیا ہے کہ مایوسی کی وہ فضا جس سے کہ آج کا تقریباً ہر دوسرا فرد دوچار ہے، کو شکست و ریخت کی اس دیانت کے ساتھ بیان کیا ہے جو بہت سنجیدگی اور ہوش مندی کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ زندگی کے اس نظام اخلاق پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں جو دہشت کے عہد میں بھی نجات کی راہیں نہیں سجھاتا بلکہ اس پر انتشار معاشرے کی ذہنی بے چینی کو ایک آڈیولاجی سے تعبیر کرتا ہے۔ انہیں انسانیت کے ان احساسات پر یقین ہے جو ہمارے رومانی اور کلاسکی اعتدال کا محور رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ حکیم منظور کے یہاں وجودیت کا اثر زیادہ ہے۔ لیکن اسے کسی خاص نکتۂ نظر سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ ان کے خیالات کی حسیت اور مزاج کی افتاد طبع کا معاملہ ہے۔ انہیں فرد اور جماعت دونوں کی اہمیت کا احساس ہے اور ان دونوں سے انہوں نے حریت فکر کو ظاہر کرنے کے اپنے اپنے اسلوب اور طور طریقوں سے کام لیا ہے۔

جا کر وہ اپنے شہر سے اس کو یقین ہے
پانی پہ کوئی نقش بنا کر ہی آئے گا

سنگ میں پھول کے اطوار کہاں سے آئیں؟
بات میری ہے، طرف دار کہاں سے آئیں؟

دست کوتاہ سے منظور کا کام آن پڑا
کتنا گر جائے گا! وہ ہاتھ بڑھائے کتنا

صحیفہ اس بدن کا بے ورق ہے
بہت محدود ہے معنی کا دامن

لاکھ طوفاں! پھر بھی جاگیں گے گلاب
لاکھ سایا! دھوپ کھلے گی ضرور

حکیم منظور کو زمانے کی موجودہ صنعتی ترقی کا پورا احساس اور اعتراف ہے۔ لیکن اسے ہر طرح کی تہذیبی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے طور پر تسلیم کرنا ممکن نہیں۔ صنعتی ترقی کا رابطہ مادیت سے ہوتا ہے اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مادیت کی سطح پر بھی سماجی طبقات میں وہ خلیج پائی جاتی ہے جس کا کوئی مثبت اثر معاشرے پر نہیں ہے۔ تو اس طرح یہ دعویٰ یا یہ خیال کہ مادی ترقی میں اخلاقی، روحانی اور اقداری ترقی بھی ہے، باطل ٹھہرتا ہے۔ حکیم منظور انسانی نفسیات کی تحقیق اور انسانی ذات کے عرفان کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں زبان کے جدید رائج تصور سے انہوں نے جو کام لیا ہے، وہ شعر و ادب کی کلاسکی روایت کے وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئے رنگ و آہنگ سے دوچار کرتا ہے۔ اس نئے رنگ و آہنگ کے پیش نظر ان کا یہ تجزیہ قابل قدر ہے۔

سوال: کیا حرف ابتدا تھا؟	جواب: اب یہ سوال کیا ہے؟
سوال: میں حرف آشنا ہوں؟	جواب تیرا خیال کیا ہے؟
سوال: منصب قلم کا کیا ہے؟	جواب: کاغذ میں شعلہ کتنا؟
سوال: رنگوں کا سلسلہ کیا؟	جواب: رنگوں کا حال کیا ہے؟
سوال: نطق سکوت کیسا؟	جواب: دل سے ہو آشنا بھی؟
سوال: دل بولتا ہے کیسے؟	جواب: کوشش محال کیا ہے؟
سوال: تنہائیوں کا مقصد؟	جواب: مہمل بھی کوئی شئے ہے؟
سوال: وا راز دل کروں کیا؟	جواب: پھر اعتدال کیا ہے؟
سوال نقش تمام کیسا؟	جواب آنکھوں کی سوچ کتنی؟
سوال: دن کا سوال کیا ہے؟	جواب: شب کا کمال کیا ہے؟

حکیم منظور کے سرچشمۂ فکر پر غور کیا جائے تو مشرق و مغرب کے بیشتر فکری معیاروں سے پھوٹتا ہے۔ لیکن ان کی بنیاد مشرقیت ہے جس میں انہوں نے مغرب کے ان اصول و نظریات کو بھی شامل کیا ہے جو خالص مشرقیت کے زیر سایہ دیار مشرق کے تہذیب و تمدن کا ہی ایک حصہ قرار پاتے

ہیں۔ان میں سب سے اہم ردوقبول کا وہ سلسلہ ہے جونظام فکر کے اکثر پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس طرح شعری شخصیت کی تشکیل میں ہندایران اور اسلامی فکر وفلسفہ کے ساتھ ساتھ مارکس اور اینگلز کے مادی تصورات کا بھی ردوقبول کی صورت میں دخل ہے۔انہوں نے علوم جدیدہ سے استفادہ کرتے ہوئے تخلیقی سطح پر آزادانہ رویہ اختیار کیا ہے۔اس سلسلے میں انہوں نے اپنے پیش روؤں سے اختلاف نہیں کیا بلکہ ان کے فکروفن کا بڑی کشادہ دلی سے اعتراف کیا ہے۔اوراس سلسلے کو آگے بڑھانے کی کوشش اور کاوش ان کے فن میں جابجا نظر آتی ہے۔

سانحہ! مہمل کے قد سے پڑ رہی ہے کم معانی کی قبا
حادثہ! الفاظ کے جنگل میں اک حرف خبر ہے بے اماں

رنگوں سے آلودہ نظر، شیشے کے رستوں کا سفر
ہر اک قدم اک امتحاں، اللہ بس باقی ہوس

روز ازل سے ایک ہی منظر ہے رقص میں
یعنی یہ کائنات برابر ہے رقص میں
کچھ بات ایسی ہے کہ سمندر اداس ہے
کچھ بات ایسی ہے کہ شناور ہے رقص میں
اس کا یہی تضاد ہے اس کے لیے عذاب
اندر تمام زخم ہے، باہر ہے رقص میں

یہ کوئی دوست نہیں، راستے کے پتھر ہیں
مگر بشرط رفاقت یہ کتنے بہتر ہیں

حکیم منظور آج ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اپنے اشعار کے توسط سے اہل ادب کے دلوں میں موجود ہیں۔انہوں نے اپنی تخلیقات سے اردوادب میں جو اضافہ کیا ہے، وہ آئندہ زمانوں میں بھی تشنگان ادب کو سیراب کرتی رہیں گی۔

نمونۂ کلام

سب کی اپنی اپنی قسمت، کیسی خوشی یا کیسا غم
کچھ کے لیے ہر رستہ خوشی کا، کچھ کے لیے ہر رستا غم
گویا حرف کی صورت شبنم، حرف گل پر لکھتی ہے
وہ لمحوں کی دلجوئی، پھر سب کا اپنا اپنا غم
بادل کے اپنے اندازے، سورج کے کچھ اپنے رنگ
وضع کا ہے پابند و گر نہ، سر سے پا تک دریا غم
ہر اک بحث کا اک ہی حاصل، مطلب کی بس اک ہی بات
جس کا پیکر اس کا سایا، سائے کا ہم سایا غم
حرف مسرت کا معنی ہے، فلسفیانہ رمز نہیں
غم کا غم اس کو کیا ہوگا، جس کو بھی راس آیا غم
کتنی الجھن کی باعث ہے، خالی لمحوں کی یہ سوچ
اس کی نوعیت کیا ہوتی، غم کو بھی جو ہوتا غم
بے موسم پیڑوں سے میں نے، ثمر نہ سائے مانگے ہیں
دھوپ کی اس سے کیا سازش ہے، مجھ کو ہو اس کا کیا غم
اس کے تشخص کے سب لمحے، جانے کس نے چرائے
جس میں وہ طائر گاتا تھا، یہ اس باغ کا تنہا غم
منظور اس کا نام وظیفہ، غم کا افسوں بے معنی
میرے لیے وہ نام ہی کافی، باقی ایک تماشا غم

شفق بدن، بے قرار، پر لمس خواہشوں سے
میں تنگ آیا ہوں اپنے دل کی نوازشوں سے
تمہارے آموں پہ کیا گزرتی ہے، جانتا ہوں
لہو میں اخروٹ میرے، موسم کی سازشوں سے
عبادتیں اس کی میرے کام آسکیں نہ لیکن
اسے ملا ایک راستا میری لغزشوں سے
طنابیں سالم تھیں اور دشمن کوئی نہیں تھا
ہمارے خیمے اکھڑ گئے کیسی یورشوں سے
کٹے ہوئے پیڑ اور وہ سورجوں کی زد پر
کہ لاتعلق رہا ہماری گزارشوں سے
ہمارے باغوں میں کونپلیں کیا بنائیں مسکن
ہماری یاری ہے اب بھی بے فصل بارشوں سے

ان درختوں پر بہت پھل تھے کبھی
ہاتھ موسم کے اگر شل تھے کبھی

کیوں شفق آنکھیں ہیں سب کی کیا ہوا
مہرباں ہم پر بھی بادل تھے کبھی

وہ جو بستی دیکھتے ہو، دور تم
اس جگہ آباد جنگل تھے کبھی

ایسے منظر بھی ہوئے ہیں بے لباس
آپ خود سے بھی جو اوجھل تھے کبھی

فصل گل اب دے اگر طعنہ تو کیا
اس کی خاطر ہم ہی پاگل تھے کبھی

جانے کس گردش میں ایسا ہوگیا
اب جو سنگستاں ہیں، دلدل تھے کبھی

یہ غلط! منظور، رنگ آسودہ ہے
یہ غلط! رنگ اس سے اوجھل تھے کبھی

ہم قدم، ہر راستے کو معتبر کرتے رہے
اپنی ہی شرطوں پہ ہم اپنا سفر کرتے رہے!
ایک لمحہ بھی نہیں سوچا کبھی ہم ہیں کوئی
پھر بھی ہم نے جس طرح چاہا بسر کرتے رہے!
اور کیا ہوگی سند ہم کم جگر بالکل نہ تھے
زندگانی جیسی محبوبہ سے گھر کرتے رہے!
فاصلے! بس گھومتے رہنے سے طے ہوتے نہیں
سب کو یہ معلوم تھا، دعویٰ دگر کرتے رہے!
اور وہ جنہوں نے ان کو سایۂ شبنم دیا
اور وہ پھولوں کو مانوس شرر کرتے رہے!
ہم کو اے منظور شکوہ ہو تو کس سے ہو کہ ہم
راہ گم کردہ تو تھے لیکن سفر کرتے رہے!

دستار زمیں بوس مگر سر ہیں سلامت
اس نوع کے جتنے بھی ہیں، منظر ہیں سلامت
سیراب بدن کوئی بھی پتھر نہیں ہوگا
جب تک کہ یہ کچھ شاخ ثمر ور ہیں سلامت
قاروں کی طرح ابر نہ شکوہ نہ شکایت
جھرنے کہ ابھی دست تو نگر ہیں سلامت
وہ گیت تھے کیسے، وہ پرندے تھے کہاں کے
پڑھنا ابھی اس دور کے دفتر ہیں سلامت
وہ جن سے پرے قاف ہے پریوں کا وطن ہے
رستوں میں وہی ساتھ سمندر ہیں سلامت
سوچیں تو شکستہ نہ کہیں سر نہ کہیں پاؤں
لکھنے میں تو الفاظ کے پیکر ہیں سلامت
ہتھیار مرے ہاتھ میں، اک پھول رکھوں کیا؟
اب تک کہ لہو پوش ستمگر ہیں سلامت
منظور نہیں ہے تو، فقط دشمن خوش ذوق
ورنہ ابھی میدان میں لشکر ہیں سلامت

یہ ہے میرا شہر، قاتل جانے اب کس صف میں ہو
کچھ کہا جاتا نہیں ہے کون کب کس صف میں ہو
چاہیے جن کو خراج آئینہ، بے چہرہ ہوں
حکم جب یہ ہو تو اک شائستہ لب کس صف میں ہو!
بے ادب ہو کر اگر ہیں اولیں صف میں جناب
آپ ہی انصاف کیجیے با ادب کس صف میں ہو!
جب سماعت زار ہوں باسی، قلم بوسیدہ ہوں
چاہے کتنا ہو سخن عالی نسب کس صف میں ہو؟
جب نہ استدلال نے منطق سے قائل ہوں فریق
صبر کی صف کیا رہے، دست غضب کس صف میں ہو!
دو مخالف خط ہوا کرتے ہیں ہم دیگر رفیق
رنج ہو بے صف اگر، کوئی طرب کس صف میں ہو!
رت بدلتے دیر کیا لگتی ہے اب جو دوست ہے
جانے کب ہو لاتعلق اور کب کس صف میں ہو!
میرے نو تخلیق لفظوں کی پذیرائی نہیں
جس کا سرمایہ ہوں حرف بے نسب، کس صف میں ہو
العطش ان کو بھی دریا جن کے ہاتھوں کا اسیر
سوچئے منظور مجھ سا خشک لب کس صف میں ہو

باہر ہزار جشن ہے، اندر اداس ہے
پتھر تراشتا ہوا آذر اداس ہے

سردی کی دھند، جسم کی تنہائیوں کا کہر
شب کی گرفت سخت سمندر اداس ہے

خوں تشنہ شام، زور سیہ، زخم آفتاب
پاؤں سے سرتک آنکھ کا منظر اداس ہے

طوفان رنگ، کاغذ سادہ، قلم قلم
بھنورے کی آنکھ، پھول کا بستر اداس ہے

خوں برف، ہاتھ سرد، نگاہیں تمام خون
میدان بے حریف کا لشکر اداس ہے

بار ہوائے زرد تو سر سے اتر گیا
مقتول حرف شکر ہے، خنجر اداس ہے

موتی کا کرب کرب تہہ آب کی گرفت
خالی صدف بدست شناور اداس ہے

مہمل ہے اس کے واسطے ترکیب اعتدال
خوش سر بسر کبھی وہ سراسر اداس ہے

کیوں چیختا اڑا ہے پرندوں کا ایک جھنڈ
منظور کوئی شاخ ثمر ور اداس ہے

کوئی پیام اب نہ پیمبر ہی آئے گا
وہ شب ہے، آسمان سے پتھر ہی آئے گا

جا کر وہ اپنے شہر سے اس کو یقین ہے
پانی پہ کوئی نقش بنا کر ہی آئے گا

اتنا بدل گیا ہوں کہ پہچاننے مجھے
اس کے بھی دل جو ہوگا کبھی بھر ہی آئے گا

کیا سوچ کے گیا ہے خلاؤں کی سیر کو
اب کے پرندہ لوٹ کے بے پر ہی آئے گا

خوشبو کا انتظار نہ کر بیٹھ کر یہاں
شیشے کے اس مکاں میں پتھر ہی آئے گا

پتھر کوئی فضا میں معلق رہے گا کیوں
منظور طے ہے یہ کسی سر پر ہی آئے گا

سنگ میں پھول کے اطوار کہاں سے آئیں!؟
بات میری ہے، طرف دار کہاں سے آئیں!؟

ہے میرے سامنے اک فصل بھرا کھیت، مگر
سائے کچھ ہوتے شجر دار، کہاں سے آئیں!؟

ہاں! مقابل نہیں کوئی کہ ہوں اپنی صف میں
ہاں! ادھر میرے طرف دار کہاں سے آئیں!؟

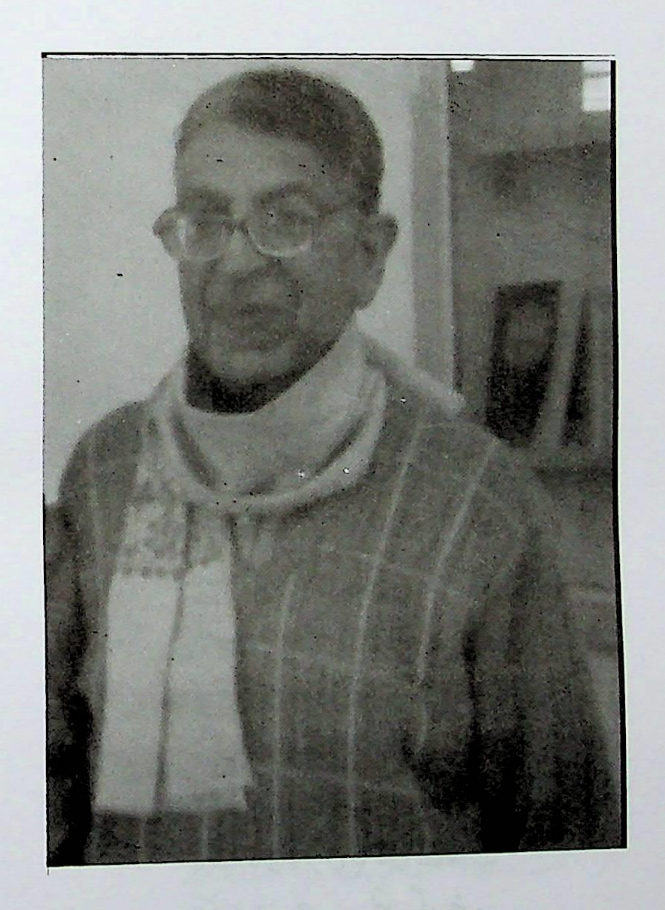
ہاں! جنوں میرا ہی گل رنگ خیالوں کی تلاش
ہاں! میرے جیسے خود آزار کہاں سے آئیں!؟

رخ بہ رخ، صرف عبارت ہے تکلف کا غبار
اب یہاں آئینہ بردار کہاں سے آئیں!؟

پاس منظور ہے خوشبوؤں کا خرمن لیکن
اس خزانے کے خریدار کہاں سے آئیں؟

المدد! گویا ہو، اے حرف شعور
خود کو میں لکھوں گا کیا، ظلمت کہ نور
ایسے میں منظر کوئی سوچوں تو کیا
سب فسوں تحریر، آنکھیں بے حضور
آپ سے اتنا جواباً عرض ہے
کچھ پڑھا جاتا نہیں، بین السطور
کس سے اگلے موڑ کی بابت کہوں
لوگ سب سیماب پا، شور نشور
لاکھ طوفاں پھر بھی جاگیں گے گلاب
لاکھ سایا دھوپ لپکے گی ضرور
فہم سے بالا نہیں منظور میں
تم نہیں سمجھے تو میرا کیا قصور

حامدی کاشمیری



حامدی کاشمیری کا فنِ شاعری......چند نکات

آئی۔ کے رچرڈسن نے شاعری کی تعلق سے فرمایا ہے:

''شاعری جن بیانات سے بنتی ہے، وہ اس میں محض اپنے
آپ کے لئے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہیں کہ وہ ہمارے احساسات پر
اثر انداز ہوسکتی ہے۔''

یقیناً کائنات کی ہر وہ شے جس میں زندگی سانس لیتی ہے، فطری طور پر شاعری کا جز ہوتی ہے۔ اور وہ اشعار جن میں زندگی سانس نہیں لیتی، ان میں معتبر شاعر کے الفاظ زندگی کا کام کرتے ہیں جن سے وہ جیتی جاگتی اور سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس صنف کے باوصف اس کی شاعری کا فکری ڈھانچہ شعریات کے تقریباً تمام مضمرات کا احاطہ کرنا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اپنے ذہن وشعور کو اس فکری صلاحیت کے معیار تک لے جانا دشوار ترعمل ہے اور اس میں قدم قدم پر خطرات بھی بہت ہیں۔ اس لئے جدید غزل کے امام باؔنی نے جہاں شاعری میں مستعمل لفظیاتی اور علامتی اسلوب کے دشوار تر کامیاب عمل کا بیان یوں کیا ہے۔

شاعری کیا ہے کہ اک عمر گزاری ہم نے
چند الفاظ کو امکان و اثر دینے میں

(بانی)

وہیں اس کامیاب عمل کے بعد شعر وجود میں آتا ہے اس کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

خاک وخوں کی وسعتوں سے باخبر کرتی ہوتی
اک نظر امکاں ہزار امکاں خبر کرتی ہوتی

(بانی)

حامدؔی کاشمیری کے اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو ''اک نظر امکاں ہزار امکاں'' کا تصور خود بہ خود ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے۔ ان میں وادی کشمیر کی مخصوص تاریخ وتہذیب کی آمیزش اور اس

کے عصری وسائل کے ساتھ ساتھ اور بعض جگہ انہیں کی روشنی میں فرد کے انفرادی دکھوں اور مسئلوں کے ساتھ غم انگیز قرب کی صورت میں شامل ہیں۔

ہوا سے آ رہی ہے لو لہو کی در
ضرور اس بستی میں مقتل رہے ہیں

واہمے سے یقیں بھی ہوتے ہیں
آسماں ہی زمیں بھی ہوتے ہیں

ہو گئیں غرقاب کتنی کشتیاں
کتنے طوفاں جو بہاروں میں رہے

یوں تو انجم کی ہمدمی سی ہے
ترگی خون میں جمی سی ہے
کی گئی ہے صبا نہ جانے کیا
پھول کی آنکھ میں نمی سی ہے

جیسا کہ اشعار سے واضح ہے کہ حامدیؔ کاشمیری کا قلم مبہم، غیر محسوس اور غیر ارادی طور پر بھی آفاقی جذبات اور مقاصد کی آئینہ داری موثر طریقے سے کرتا ہے۔ آخری شعر کلاسکی ہوتے ہوئے مراجعت کا اشاریہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ صبا کے ''نہ جانے کیا'' کہہ دینے سے پھول کی آنکھ میں ''نمی سی'' کا ہونا دلالت کرتا ہے کہ یہ معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر ہے یعنی قافلہ آگے کی جانب ہی گامزن ہے۔ زندگی کو سمجھنے اور اس کی جدو جہد کی دریافت کا عمل مثبت اور کبھی منفی جذبۂ تعمیر کی صورت معاشرے میں کارفرما حقائق کی اصل کا متلاشی رہتا ہے۔ ان کے اشعار جذبات اور کیفیات کو نظام فطرت کے طور اپنی گرفت میں لیتے ہیں اور معنی کے اس پورے منظر کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کے بارے میں باقیؔ نے کہا ہے۔

وہ آنکھ میں پورے پورے منظر
وہ پورے پورے منظر کشادہ

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کتنے سورج فلک سے اترے ہیں
گھور اندھیرا دکھائی دیتا ہے
روک سکتی نہیں ہے ایک تپاں
دریا دریا دکھائی دیتا ہے

کبھی پلٹ کے بھی آئیں یقیں نہیں رکھتے
ہم اپنے پاؤں کے نیچے زمین نہیں رکھتے

یہ چلتی پھرتی سی لاشیں شمار کرنے کو
پڑا ہے کام سر رہ گذر کرنے کو
بدن کو چاٹ لیا ہے سیاہ کالی نے
ابھی تو کتنے سمندر ہیں پار کرنے کو

دیکھنا اک روز گزرے گا سروں سے سیل خوں
توڑ کر ہر خموشی ہم زباں کھل جائیں گے

مندرجہ بالا اشعار میں بعض کشمیر کی فکری اور تہذیبی زندگی کے انتشار کو ظاہر کرتے ہیں لیکن علامتی طور پر یہ انتشار تمام کائنات کی فکری تہذیبی زندگی کا انتشار قرار پاتا ہے۔ حامدؔی کاشمیری اپنے شعری فکری عناصر کو آہنگ بلندی اشارتی اور علامتی متنوع کے ساتھ قائم کرتے ہیں اشعار کی حقیقت فلسفے کی حقیقت سے ہم آہنگ اور بعض اوقات متضاد ہونے کے سبب ہر مکتب فکر کے قارئین اور سامعین کے نکتہ ہائے نظریات کو متاثر کرتی ہے۔ چونکہ فکر کے بعد شاعری کا سب سے بڑا عمل پیرا اظہار ہوتا ہے۔ ان کا پیرایہ شعریات کی اختصاصی وسعتوں میں قطعیت کی تلاش میں موضوع کی نوعیت کی حد کو ملحوظ رکھا ہے۔ ورنہ یقینی طور پر اس سے شعر کی معنویت متاثر ہوتی ہے۔ ارسطو کا بیان ہے:

”پڑھے لکھے آدمی کی پہچان یہ ہے کہ اشیا کے ہر طبقے میں صرف اسی حد تک قطعیت کی تلاش کرے جس حد تک موضوع کی نوعیت اس قطعیت کی اجازت دیتی ہے۔“

ہوا ہر شے بہا کے لے گئی ہے
وہی خون گشتہ منظر رہ گئے ہیں
زمینوں کا نشاں تک بھی نہ ابھرا
سمندر تھے سمندر رہ گئے ہیں
قدم رکھنے کا اب یارا نہیں ہے
پہاڑ آئینہ خانے ہو گئے ہیں

عزیزو چارہ جوئی کیا کروگے
غم دل کا سبب کوئی نہیں ہے

تیرگی کی امنڈتی لہروں پر
چاندنی جھیل پار کرتی ہے

مجھ کو مرنے کی کوئی عجلت نہ تھی
خود سے ملنے کی کوئی صورت نہ تھی
وحشت دل تھی بگولے کی طرح
رہگذر کوئی نہ تھی منزل نہ تھی

حامدیؔ کاشمیری کے شعری موضوعات پر غور کیا جائے تو واقعات کی غیر مسلسل کڑی ان کی شاعری میں پنہاں محسوس ہوتی ہے۔ شگفتہ، شاعرانہ اور عالمانہ مزاج جس میں مشاہدات کے زیری لہریں موجود ہیں ان کی مذہبی، فلسفیانہ اور اخلاقی موضوعات کو تخیلی وجدان اعلیٰ معیاری قدروں پر پرکھتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ کہ انہوں نے سماجیاتی اور نفسیاتی عروج وزوال اور اس کے اسباب کو ہمیشہ نظر میں رکھا ہے۔ اسی لئے ان کے اشعار میں کوہ، صحرا، وادی وغیرہ الفاظ کا علامتی اور استعاراتی انسلاک اتحاد وملت کے عروج وزوال کے مابین مثبت اور منفی دونوں قسم کے تصورات کی روشنی میں حیاتی کیفیتوں کے ساتھ نمایاں ہے۔ علاوہ بریں ان کے بعض الفاظ جو کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، محض تاثرات وخیال کے طور پر نہیں بلکہ وادی کشمیر کے مخصوص تجربوں کو فطری طور پر ابھارتے ہیں۔ ان میں آسمان، زمین، کوہ، صحرا، وادی برف وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس طرح ان

کا استعاراتی اور علاماتی استعمال لفظی اور معنوی ارتقا کی منزلیں یکساں طور پر طے کرتا ہے۔ ان کے اشعار کی پختگی اور قوت بیان حکیمانہ طرز سے عاری ہونے کے سبب لفظی تناسب، رعایتیں اور مناسبتیں کہیں واقعاتی بیانیہ اور کہیں جذباتی تسلسل کی صورت میں سامنے آتے ہیں لیکن اس طرح وہ دنیاوی مسائل کو اور ان کے تقاضوں کو عمومی نہیں بلکہ فن کارانہ انداز میں برتتے ہیں۔ گاٹ فریڈ بن Gott Freidbenn نے فن کے تعلق سے عمدہ بات کہی ہے۔

"فن ریاست یا تاریخ سے الگ مقام پر قائم ہوتا ہے اور اصلاً اور اصولاً دنیا اسے کسی نہ کسی طرح جھٹلاتی اور دھتکارتی ہے۔"

ممکن ہے کہ حامدؔی کاشمیری کے فن کو کسی طرح بھی جھٹلایا اور دھتکارا نہ گیا ہو اس لئے کہ فن کے ان نظریات کے پس پشت اس کی اپنی دنیا ہے اور حامدؔی کاشمیری کی دنیا خالص ہند آرائی اور ہند ایرانی تہذیب کی دلدادہ۔ اور یہاں عدم توجہی اور مذمت کا وہ رویہ یا وہ نوعیت نہیں ہے لیکن پہلی بات بین نے جو کہی ہے وہ یقیناً ایک آفاقی سچائی ہے ایک ایسی حقیقت جو ملک وقوم کی تمام سرحدوں کو توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اس سے آگے جا کر تمام کائنات کو اس ضمن میں سمیٹ کر یکجا کر دیتی ہے۔ حامدؔی کاشمیری کے چند اشعار ہیں۔

تھا گریزاں آنکھ سے شہر یقیں
کوئی دیوار گماں حائل نہ تھی

کتنے سیل تند پیغام فنا دیتے رہے
آخری پل تک سر ساحل دعا دیتے رہے
ان کا شوق کوہ پیمائی جنوں انگیز تھا
اہل وادی دیر تک ان کو دعا دیتے رہے

نہ جانے کتنے ہی صحرا عبور کر آئے
پس غبار صدائے جرس کہاں تک ہے

گئے سب کے سب ساتھ چھالے رہے
وہ تیرگی میں اجالے رہے

حامدؔی کاشمیری کی شاعری کا ایک بڑا مقصد انسانی اقدار کی زبوں حالی کی علامتی اور استعاراتی طور پر نشاندہی اوران کی جانب توجہ دلانا بھی ہے۔ان کے اس شعوری فیصلے میں اخلاقیات کا پورا نظام کارفرما نظر آتا ہے۔اس کے ذریعہ انہوں نے نئی نئی دریافتوں کی جانب جواشارے کئے ہیں وہ انسانی تاریخ کے فکری نظام کے خلافی تصورات کو بھی کنایتاً پیش کرتے ہیں۔تغیرات اور مظاہر کی بوقلمونی اشعار کے فطری حسن کو زائل نہیں ہونے دیتی چونکہ اصل شاعری کی باطنی آنکھ تہہ درتہہ الفاظ میں پوشیدہ معنوی انسلاکات کے پھیلاؤ اور گہرائی کو امکانات کی لاتعداد وسعتوں میں دیکھتی ہے ۔اسی لئے ایک حد تک وہ عمومی بصیرت اور بصارت کو کوئی خاص اہمیت نہ دینے کے سبب محروم بھی رہ جاتا ہے۔لیکن یہ عمل اس کے اشعار کی قدر و قیمت پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں کرتا جیسا کہ حامدی کاشمیری کے اشعار سے واضح ہے۔

کوئی بستیوں میں نہ باقی رہا
فضاؤں میں خاموش نالے رہے

وحشت رفتار میں کوئی نہ کوئی بات تھی
سر پھرے خاموش جنگل راستہ دیتے رہے

شبوں میں یوں ہی بہاتے نہ تھے لہو اپنا
وہ عام لذت تنویر کرنے والے تھے

افق کے پار بھی کتنے نظارے روشن ہیں
یہ دیکھنا ہے کہ حد نظر کہاں تک ہے

رہ گزر میں کوئی نشاں بھی نہیں
وہ زمیں بھی وہ آسماں بھی نہیں

آنزکس نے جدید شاعری کا محاکمہ کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے کہ:

''بیسویں صدی جس حد تک اپنے مطالعے چھان بین تجزیہ و تفہیم میں مصروف ہے دنیا میں کوئی صدی کبھی نہیں رہی۔''

حامدؔی کاشمیری کے اشعار آنز کس کے اس خیال پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔ وہ جس عرق ریزی اور شدت سے اپنا شعری احتساب کرتے ہیں اور اپنی شاعری کو اعلیٰ شعری معیاروں پر پرکھتے ہیں۔ وہ ان کی شعری کائنات کو مزید باریک اور تکمیل یافتہ (Finely Perfected) بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ چونکہ وہ بہت اہم اور معتبر ناقد بھی ہیں اس لئے خود تجزیاتی مہم میں تنقیدی عناصر کا شامل ہو جانا تعجب خیز امر نہیں۔ ویسے بھی شاعر اپنی تخلیقات کا سب سے پہلا ناقد ہوتا ہے۔

حامدؔی کاشمیری کے اشعار میں وجود کے کئی رنگ اشارہ کرتے ہیں کہ ان کا اظہار ذاتی حیثیت کی حدود سے آگے بڑھ کر مابعد الطبیعات کی حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ چند اشعار:

تم سے کیونکر میں رابطہ کر لوں
مرے زیر قدم زمیں ہی نہیں

آسمانوں سے بھی آگے تھا میں
پاؤں کے نیچے زمیں ہے، کہا ہے

جو سمت نما ہو وہ ستارہ ہی نہیں ہے
ظلمت کے سمندر میں کنارہ بھی نہیں ہے
کیوں کوہ و بیاباں کو میں چھوڑ آیا ہوں پیچھے
مجھ کو تو سمندر نے پکارا ہی نہیں ہے

کیا گزرتی ترے گزرنے پر
ہر کڑے امتحاں سے گزرے ہیں

حامدؔی کاشمیری انسان کی موجودہ صورت حال کا مطالعہ بشریت کے غیر محدود حوالوں کے ذریعے کرتے ہیں۔ آج کی زندگی کے مسائل کا مطالعہ انھوں نے آرنالڈ کے قول دو میں جو یہاں ہوں، کیوں ہوں رکی ضمن میں کیا ہے۔ معنی کے اعتبار سے حامدؔی کاشمیری کے یہاں پیچیدگی ہے لیکن اس میں وسعت بھی پوشیدہ ہے۔ انھوں نے داخل سے خارج اور خارج سے داخل کا یہ سفر مادی ماحول کو گرفت میں لانے کے لئے موجودہ سماج کے تقریباً سبھی گوشوں کی علامتی یا استعاراتی طور پر برتا ہے۔ ان کا احتجاجی رویہ جدید طرز حیات کے دستاویزوں کو پر اسراریت کے لباس میں پیش کرتا ہے۔

لیکن یہ رویہ مختلف پیکروں کے متنوع استعمال کے سبب انتہائی نامانوس نہیں معلوم ہوئے بلکہ دماغ پر زور دینے اور اس کی اسراری فضا پر غور وخوض کرنے سے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

اپنی پہچان مٹ نہ جائے کہیں
کوئی دیوار درمیاں رکھنا

ابر کے سڑکوں پہ مہتاب چپ نہ بیٹھے گا
تمام رات پہ گھر گھر پکار آئے گا
صرف لا صرف ایک نوشتہ ہے
وقت پڑنے پہ کام آئے گا

آب پر نقش عبارت کرتے
ہر حقیقت کو حکایت کرتے
پھول مسکان لئے آتے ہیں
دل کے داغوں کی نمائش کرتے

اس طرح دیکھا جائے تو حامدؔی کاشمیری کی شاعری معنی کی کسی نہ کسی نئی جہت اور تجربے کی کسی نہ کسی اہم سمت کا احاطہ ضرور کرتی ہے۔ چاہے وہ ذات سے کائنات تک کا سفر ہو یا پھر مخصوص احساسات کی روشنی میں اپنی مٹی، اپنی زمین اور حالات کے اُجاگر نے میں۔ ان تمام مقامات پر ان کا فن شعریات کی اعلیٰ قدروں کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

نمونۂ کلام

ہجوم حرف میں کس کو ہے معجز کار ہو جانا
قدم رکھنے نہ پائے دشت کا گلزار ہو جانا
مرے سینے سے لگ جانا کہ جیسے
اندھیرے میں دمکتے جسم کا تلوار ہو جانا
یہ جوئے اشک بہہ نکلے گی قلزم آشنا ہونے
نہیں ممکن بلند و پست کا ہموار ہو جانا
نکلتا ہے جو کوئی کھوج میں چٹان بنتا ہے
بہت آسان نکلا کاشف اسرار ہو جانا
تمہیں ہی کیا میں خود اپنے بدن کو چھو نہیں سکتا
ہے دہشت خیز کتنا خواب میں بیدار ہو جانا
وہ ساری دھوپ اپنی مٹھیوں میں لے کے جائیں گے
یہی ساعت ہے برفیلا سمندر پار ہو جانا

خاک سے پھوٹے گی صورت آشنا ہو جائے گی
کون کہتا ہے فنا ہو کر فنا ہو جائے گی

خامشی، بے صوت شبنم کونپلوں پر رات کو
صبح ہو جائے گی، سیلاب صدا ہو جائے گی

شق ہوئی جاتی ہیں قبریں، کوہ لرزہ کوش ہیں
کیا قیامت وقت سے پہلے بپا ہو جائے گی

قہر بن کر آئے گی اس بار برفیلی ہوا
پتی پتی دیکھنا حرف دعا ہو جائے گی

کون بانٹے گا سیہ راتوں کی تنہائی کا درد
اک کرن ہے وہ بھی اب ان سے جدا ہو جائے گی

دور ہونے پر وہ بے تابانہ آئے گی قریب
کیجیے قربت کی خواہش تو ہوا ہو جائے گی

معدن لعل و جواہر رہ گئے ہیں
کالے پانی میں جزائر رہ گئے ہیں
کون دے گم گشتہ ساحل کی خبر
بحر اخضر میں وہ طائر رہ گئے ہیں
بے خطر پانی میں اترے تہہ شناس
ساحلوں پر اہل ظاہر رہ گئے ہیں
سب عقیدت مند رخصت ہوگئے جب
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے ہیں
راہب خورشید رو بھی منتظر ہے
کن سیہ راہوں میں زائر رہ گئے ہیں
وہ محافل، وہ ملاقاتیں کہاں اب
ملنے کی جگہ مقابر رہ گئے ہیں

کتنے آدم کش پرندے خوں کے اندر پل رہے ہیں
کب سے میرے ہم سفر کالے گھنے جنگل رہے ہیں
ایک شب نا آشنا دن کی تمازت اوج پر ہے
ہاں یہ سچ ہے ساتھ میرے کچھ قدم بادل رہے ہیں
جذبۂ منزل رسی کیا، ایک سودا ہے سروں میں
بے نشاں راہوں میں محروم بصارت چل رہے ہیں
اس کے جانے پر چمن کا حال کیسا ہوگیا ہے
ہیں فگندہ سر پرندے ہاتھ پتے مل رہے ہیں
دن نکلنے پر بجھائیں گے لہو سے تشنگی کو
کتنی راتوں سے سراب و کرب میں بے کل رہے ہیں
کیا فضائیں آسماں تک پانیوں سے بھر گئی ہیں
عکس زیرِ آب میں سنگ و شجر سب ڈھل رہے ہیں

منتشر ہیں قویٰ بہم کیا ہے
دوستو، ربط دشت ویم کیا ہے
پیش آتا ہے اس سفر میں کیا
میری پیشانی پر رقم کیا ہے
سیل شب، سب بہا کے لے جائے
کوئی تمیز کیف و کم کیا ہے
آبشاروں کے قہقہے گونجے
ایک نرگس کی چشم نم کیا ہے
ہم نے تیرے کرم تو دیکھے ہیں
دیکھنا ہے ترا ستم کیا ہے
دھند میں چھب دکھا کے چھپ جانا
یہ عنایت بھی آخر کم کیا ہے

ان سے بھی لرزہ خیز تھے منظر کہیں کہیں
پھنکارتے تھے سایوں کے پنجر کہیں کہیں

آنکھیں ہی خوگرفتۂ دشت و سراب ہیں
آئے تھے راہ میں بھی سمندر کہیں کہیں

گنج گہر کے دھوکے میں آئے، عجب نہ تھا
ظلمت میں جگمگاتے تھے پتھر کہیں کہیں

رکھ لو یہ حرف سبز بھی تیغ و تبر کے ساتھ
بدلیں گے چہرے بھی کرم گستر کہیں کہیں

اک گنج بے بہا ہے بدن ڈھانپ کے چلو
ہوں گے ضرور دزددلاور کہیں کہیں

خاموش بند کمروں میں بے سدھ پڑے رہو
کالے نشان ہیں برف کے باہر کہیں کہیں

یہ کیا ضرور ہے کہ لہو رائیگاں ہی ہو
ممکن ہے دشت میں اگیں اژدر کہیں کہیں

احتساب بیش و کم کرتے رہے
خود کو خود ہی کالعدم کرتے رہے
فصل گل خوابوں میں لہراتی رہی
خون سے صحرا کو نم کرتے رہے
جان سے جانا تماشا تو نہ تھا
سرگزشت سب رقم کرتے رہے
اپنے ہاتھوں کن کو دفناتے رہے
یاد کن کو دم بدم کرتے رہے
آخرش گھر گھر مقفل کر گئے
جو نہ وہ کر پائے ہم کرتے رہے
کیا بھلا کرتے طلوع مہر تک
خود ہی اپنے سر قلم کرتے رہے

کن سے امید کرم کرتے رہے
خود پہ خود کیا کیا ستم کرتے رہے
دھند میں ایک ایک ساحل بہہ گیا
پر سفر ہم یم بہ یم کرتے رہے
کوئی رستہ تھا نہ تاروں کے لیے
نور کو ظلمت میں ضم کرتے رہے
خون ارزانی کی کوئی حد نہ تھی
بنجر ستاں کو ارم کرتے رہے
شادی کا شاید تصور ہی نہ تھا
غم نہ ہونے کا بھی غم کرتے رہے
کس قدر منزل رسی کی چاہ تھی
رہگزر کو ہم قدم کرتے رہے

محرم راز قضا کرنا نہ تھا
ہم کو یوں بے آسرا کرنا نہ تھا
ہو ترے زندان آب و گل کی خیر
خواب میں اک پل رہا کرنا نہ تھا
جان لینے سے کوئی کیا روکتا
سب کے آگے برملا کرنا نہ تھا
کیا ہے یہ التباس ہست و بود
ہم کو اسرار آشنا کرنا نہ تھا
اب کہیں ٹھنڈا نہ ہو نار جحیم
اشک باری کو روا کرنا نہ تھا
راس آئے گا خلاؤں کا سفر
اب کسی کا سامنا کرنا نہ تھا

پل میں سورج وادیوں میں سرنگوں ہو جائے گا
شعلہ منظر سایہ در سایہ فسوں ہو جائے گا

بے صدا شب میں پرندوں کا سفر جاری رہا
شہر اندر شہر، دن کو کشت و خون ہو جائے گا

وہ ہوا چلتی ہے اب مٹ جائے گی تفریق رنگ
چہرہ چہرہ سایہ سایہ نیلگوں ہو جائے گا

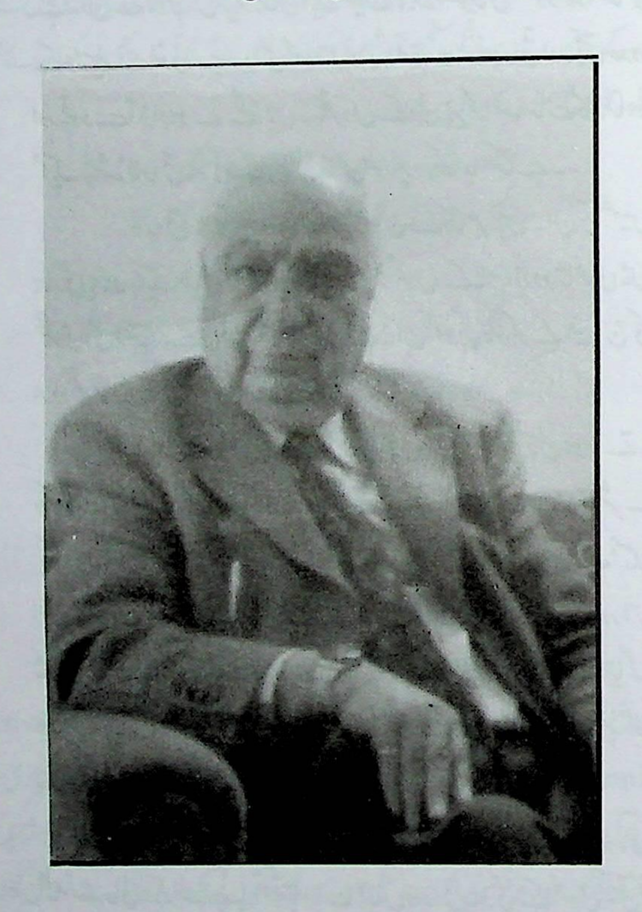
اڑ رہی ہے شیشوں کی آنکھوں میں صحراؤں کی آگ
مر گئے، باقی جو ہیں ان کو جنوں ہو جائے گا

مل ہی جائے گا وہ چشمہ ان پہاڑوں میں کہیں
آگہی کا درد ہے دیکھو فزوں ہو جائے گا

شاخ سے قطع تعلق پر اسے اصرار تھا
غل ہوا مغرور ہے، خوار و زبوں ہو جائے گا

ہم نے بھی دیکھی وہاں گرتی ہوئی سورج کی راکھ
شکر کر لو پھر سے یخ بستہ سکوں ہو جائے گا

فاروق نازکی



فاروق نازکی۔اردو ادب کی ایک معتبر آواز

''فاروق نازکی کی شاعری وسیع تر انسانی نفسیات کی ترجمان ہے۔ان کے کلام میں یہ ترجمانی ایک لطیف مابعد الطبیعاتی تصور اور احساس کے وسیلے سے ہوتی ہے۔داخلی محسوسات بسا اوقات موضوعاتی اور ہیتی حدود اور قیود سے آزاد ہونے لگتے ہیں۔پتھروں کے دل چیر کر احساسات کا ابلتا ہوا 'ایک چشمہ' فاروق نازکی کے یہاں خاص طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

فاروق نازکی بنیادی طور پر نظموں کے شاعر ہیں۔ان کی نظمیں ہماری بات، ایک خیال، مشورہ اور ایک نظم جنگلوں کے نام، اردو شاعری میں فکری وفنی اعتبار سے نئی فضا کی تعمیر کرتی ہے۔ان نظموں کا ذکر کیے بغیر آج کی اردو نظم نگاری کا صحیح منظرنامہ سامنے نہیں آسکتا۔

فاروق نازکی اپنی ذات کی گہرائیوں میں اتر کر گم نہیں ہو جاتے۔ بلکہ جب وہ اپنے شعری سرمائے کے ساتھ باہر آتے ہیں، تو اپنے معاشرے کی دبیز تاریخ بھی لے آتے ہیں۔ایک ایسی تاریخ جو عہد حاضر سے ہمیں اتھاہ ماضی کی طرف لے جاتی ہے۔اپنے Iniciation کی تلاش اور اس میں غیر معمولی انہماک ان کی شاعری میں صوفیانہ نقطۂ نظر، انجذاب، تیاگ اور کشادہ ذہن وروح کی خصوصیات پیدا کر دیتا ہے۔ان کا مجموعۂ کلام ''لفظ لفظ نوحہ'' تجسس اور انکشاف کا اظہاریہ ہے۔''

(علیم اللہ حالی)

علیم اللہ حالی کے مندرجہ بالا اقتباسات جہاں فاروق نازکی کے مجموعی تخلیقی تصور کے بعض عناصر کی نشاندہی کرتے ہیں، وہیں صنف نظم سے ان کے تخلیقی ذہن کے گہرے تعلق کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ فاروق نازکی نے نظموں کی بہ نسبت غزلیں کم کہیں ہیں لیکن غزلوں کے حوالے سے بھی ان کا تخلیقی عمل اپنی مستحکم شناخت قائم کرتا ہے۔

فاروق ناز کی کے غزلیہ اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری نہ تو کسی طے شدہ راستے پر سفر کرتی ہے اور نہ ہی کوئی شعری عقیدہ یا نظریہ ہے، جس کی فہرست کو سامنے رکھ کر شعر کہنے کے عادی ہیں۔ ہاں ان کی کچھ اپنی مخصوص لفظیات ہیں جو اردو ادب میں ان کی شناخت کی مستحکم پہچان بھی ہیں۔ حالانکہ مجموعی طور پر انھوں نے اپنی شاعری کا نصب العین بھی کہیں واضح اور کہیں اشاراتی طور پر بیان کر دیا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت محض شاعرانہ ہے۔ نہ کہ رجحاناتی یا تحریکاتی۔ انھوں نے اپنی شاعری کے منظرنامے میں متضاد عقائد و افکار کو اپنے ذہن اور جذباتی رویوں کے ساتھ یکساں گنجائش کے ساتھ برتا ہے۔ فنی سطح پر نئی شعری جمالیات کے آئینے میں بھی دیکھا جائے تو ان کا اظہار بیان مختلف النوع سمتوں کا حامل ہے۔

منت سنگ ملامت نہ اٹھاؤں گا کبھی
کسی دیوار سے سر پھوڑ کے مر جاؤں گا

یہ کس گمان میں آ کر مرا یقیں ٹھہرا
یہ اور بات میرا امتحاں نہیں ٹھہرا
فضا تو صاف بتاتی تھی، باڑھ آئے گی
ہر اک مکان میں پھر بھی ہر اک مکیں ٹھہرا

یونہی کر لیتے ہیں اوقات بسر اپنا کیا
اپنے ہی شہر میں ہیں شہر بدر اپنا کیا

فاروق ناز کی کی شاعری میں آواں گارد کے چار بنیادی اوصاف عملیت (Activism)، جارحیت (Antigonism)، فنا پرستی (Nihilism) اور درد پسندی (Agonism) بنیادی طور پر موجود ہیں۔ اس کی وجہ شاید وادیٔ کشمیر کے حالات رہے ہیں، جس کے فاروق ناز کی خود شاہد ہیں۔ چونکہ دہشت کا اثر ہر ملک اور ہر قوم پر مثبت یا منفی صورت میں تقریباً یکساں ہوتا ہے۔ آواں گارد کے یہ چار بنیادی اوصاف دوسری جنگ عظیم کے وقت اپنی شدت کے ساتھ ابھرے تھے۔ تقسیم ہند اور تقسیم کشمیر اور اس کے نتیجے میں ہونے والی قتل و غارت گری نے فاروق ناز کی کی روح تک جھنجھوڑ دی ہے۔ جب جب فاروق ناز کی کے ذہن و شعور پر اس قسم کے کربناک منظر حاوی ہوتے ہیں، اسے وہ صفحۂ قرطاس پر اتار کر ایک طرح کا سکون حاصل کرتے ہیں۔ حالات کے ان سلسلوں سے متاثر ہونے

کے میدان کو اگر اور پھیلایا جائے تو عراق پر امریکا کے ظلم اور فلسطین کے مظلوموں تک ذہن چلا جاتا ہے۔

رات لمبی ہے چلو غیبت یاراں کرلیں
شب کسی طور تو ہو جائے بسر اپنا کیا
دوریاں، فاصلے، دشوار گزر گاہیں ہیں
ہے یہی شرط سفر، رخت سفر اپنا کیا
تجھ سے اب اذن تکلم بھی اگر مل جائے
لب ہلیں یا نہ ہلیں، آنکھ ہو تر اپنا کیا
وہ جو فاروق کا مسکن تھا کنارہ دریا
اب وہاں پر ہے کھڑا ریت کا گھر، اپنا کیا

فاروق ناز کی گذشتہ آدھی صدی سے شعر وسخن کی دنیا سے وابستہ ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ذرائع ابلاغ کے آدمی ہیں۔ اخبار سے لے کر ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ انھوں نے نہ صرف شہرت حاصل کی ہے بلکہ ان شعبوں میں جو اعتباریت حاصل ہوئی ہے، اس کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ ذرائع ابلاغ سے ہمہ وقت وابستگی کی وجہ سے ان کی ادبی کاوشیں مقدار کے لحاظ سے کم ہیں لیکن معیار کے اعتبار سے ایک منفرد اور جداگانہ حیثیت کی مالک ہیں۔ فاروق نازکی کم آمیز، کم گو یا خدا نخواستہ شرمیلے نہیں بلکہ جس محفل میں آتے ہیں۔ اس کی کامیابی کی ضمانت بن جاتے ہیں۔ لیکن ادبی رسالوں کے ساتھ باقاعدگی سے رابطہ رکھنے کے معاملے میں ان کا لاابالی پن، غیر ذمہ دارانہ رویے کی حدود کو چھو جاتا ہے۔ راج نرائن رازؔ نے غلام رسول سنتوشؔ مرحوم کو لکھا تھا۔ ''یہ وہ ظالم ہے جو خط کا جواب بھولے سے بھی نہیں دیتا۔'' راج نرائن راز اور غلام رسول سنتوشؔ اس جہان فانی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر فاروق نازکی کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اردو کے تقریباً سبھی معیاری رسالے ان کے پاس آتے ہیں۔ وہ پورے تواتر اور انہماک کے ساتھ ان کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ مگر ان رسالوں کے لیے اپنا کلام ارسال کرنے کے لیے وقت نکالنے میں ان کی دیگر اہم مصروفیات بہت مانع ہیں۔

فاروق مازکی کی غزلوں میں جو بیک وقت زمانی اور لازمانی تناظر کی گونج سنائی دیتی ہے، وہ دنیا کی آفاق گیر حقیقتوں اور اس کی تہہ میں پوشیدہ دوام کی لاحاصل آرزوؤں کی خواہش مند زندگی اور زوال اور فنا کی پیچیدگی کے تصادم سے عبارت ہے۔ یہ زوال اور فنا کے تصورات جو آسودہ سے آسودہ تر حالات میں بھی تخلیقی ذہن کے کسی گوشے میں گھر کیے رہتے ہیں، تغیر و تبدل اور اختیار و بندگی

کے نئے۔نئے تجربات سے آشنا کرتے ہوئے تخلیقی تخیل کو بھی ایک طرح سے جلا بخشتے ہیں۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ فاروق نازکی کے پیش کردہ تجربات کو محض انہیں کی ذات سے منسوب کر دیا جائے یا تخلیقی شعور کو انہیں کی ذاتی زندگی کا ایک عکس سمجھ لیا جائے۔بلکہ ان کی غزلیہ شاعری کو سمجھنے،اس سے لطف اندوز ہونے،اس سے سبق لینے اور ان واقعات ومناظر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے جو کہ فاروق نازکی کی شاعری کے متن کا ایک جز ہیں،وسیع ثقافتی اور جذباتی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

بہروں کی بستی کا گایک
نابیناؤں کا شاعر ہوں

شدت پر ہے ہرے بھرے پتوں کی پیاس
صحرا صحرا خون سمندر لکھنا ہے

انگاروں کے موسم میں
جسموں کا سا میلہ ہے

میری بستی میں آکر
پاگل دریا ٹھہرا ہے

جنوں آثار موسم کا پتہ کوئی نہیں دے گا
تجھے اے دشت تنہائی صدا کوئی نہیں دے گا

فاروق نازکی نے علوم انسانیہ اور اس کے مختلف تصورات کو کہیں تو خارجی سطح پر برتا ہے اور کہیں داخلی سطح کا آئینہ دار بنایا ہے۔اس تعلق سے ان کے اشعار بعض مقامات پر قومی اور ملکی ذہانت کے عکاس بن جاتے ہیں اور بعض مقامات پر ان کے زیر اثر زندگی کرنے والے ذہنوں کے نشیب و فراز کا وسیلہ۔اس سلسلے میں انہوں نے لفظیاتی سطح پر تخلیقی دائرہ عمل سے تجاوز نہیں کیا ہے۔یہ دائرہ عمل جہاں قومی اور ملکی ذہانت کو خانوں میں نہیں بانٹتا،وہیں اپنی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے۔ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہوئے ترویج وترقی کی راہوں کی تلاش اور زوال کے اسباب کی از سر نو دریافت کی کوشش کرتا ہے۔

کانچ کے الفاظ کاغذ پر نہ لکھو
سنگ معنی بن کے ٹکراؤں گا میں

میں ہوں مضطر بدن کی نگری میں
میرے حصے میں لا مکاں لکھنا

وہی میں ہوں وہی خالی مکاں ہے
مرے کمرے میں پورا آسماں ہے

میں اپنے حوصلے خیرات کردوں
کسی کا نقش پا منزل ہوا ہے

میں چھوڑ آیا تھا اپنے گھر کو، مگر اسی کے خیال میں ہوں
نقوش پائے ہوانہیں ہوں میں اپنے ماضی کے حال میں ہوں
بلندیوں پر قیام میرا، ہر ایک بستی میں نام میرا
میں ہرزمانے کی آبرو ہوں، عروج میں ہوں، زوال میں ہوں

فاروق نازکی کو بخوبی علم ہے کہ تخلیق کار کا اپنی تخلیقی کاوشوں سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے، خواہ اس کا نظریہ سوفی صد

'شعر میرے ہیں گو خواص چند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے'

والا ہو۔ یعنی اس کی تمام تر گفتگو عوام اور خواص کے لیے ہو۔ لیکن یہاں پہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ تخلیق کار کا شمار بھی انہیں دو طبقوں میں سے کسی ایک سے ضرور ہوگا۔ یا تو وہ خواص میں ہوگا یا عوام میں سے۔ اس لیے اس کی تخلیقی کاوشوں کے تناظر میں اسے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس طرح تخلیق کار کا فن پارے میں ایک شخصی رویہ سامنے آتا ہے۔ لیکن اس شخصی رویے کا بھی ایک ادبی جواز ہے کہ تخلیق کار بھی معاشرے کا ایک فرد ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ فاروق نازکی کے یہاں جمالیاتی معیار بہت بلند ہے۔

ہم کو خود پر بھی اعتبار نہیں
ہم سے کیا اعتبار کی باتیں

کامیابی مرا مقدر کر
زور کے ساتھ مجھ کو زر دے دے
تا بنا کی عطا ہو فرقت کو
کاسۂ چشم میں گہر دے دے

فاروق نازکی کے اشعار میں جمالیاتی معروض کی حیثیت سے کوئی حتمی فنی نتیجہ برآمد کرنا دشوار ہے۔ ان کے یہاں نفسیاتی الجھنیں غیر معمولی اہمیت کی حامل نہیں ہیں۔ ان کے برتے گئے مضامین میں شعر کی زبان، لفظوں کی ترتیب اور ان کی اہمیت اور ان تمام کو یکجہ کرنے کے بعد جو شعری سانچہ مرتب ہوتا ہے، وہ شعری سطح پر آہنگ کے اعتبار سے داخلی اور خارجی دونوں امکانات اپنے اندر سموئے رکھتا ہے۔ ان کے اشعار میں معنی کی عدم تفہیم یا پھر جذوی تفہیم کا سلسلہ ان معنوں میں موجود رہتا ہے کہ کسی ایک تشریح پر پہنچ کر معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ لفظوں کا آہنگ، ترنم اور ابہام کے ساتھ مل کر بصارت اور سماعت کے لئے ایک ایسی فضا قائم کرتا ہے کہ شعری تفہیم سے مکمل طور پر آگاہ نہ ہوتے ہوئے بھی نیم دھندلکوں میں ایک کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔

شہر سارا ہی کربلا سا تھا
جو بھی تھا خون ہی کا پیاسا تھا
تیرے حصے میں راحتیں ساری
میرے حصے میں اک دلاسا تھا

نوک خنجر روز لکھ لیتی ہے اک دفتر نیا
صبح لے آتی ہے اپنے ساتھ پھر محشر نیا
سنگ باری کے لئے موسم نہیں مخصوص اب
سنگ باری ڈھونڈ لیتی ہے ہمیشہ سر نیا

پھر پہاڑوں سے اتر کر آئیں گے
راہ بھٹکے نوجواں گھر آئیں گے

پھر تلاطم خیز ہے دریائے خوں
ہم تری تقدیر بن کر آئیں گے

فاروق نازکی کے اشعار میں جو کشمکش اور آویزش نظر آتی ہے، اس کے پشت روایت کی ایک طویل تاریخ موجود ہے۔ ان کا کشمیری ذہن مجموعی طور پر جدید ہونے کے باوجود روایت کا خاصا اثر رکھتا ہے۔ اس میں ان کے قومی مزاج کا بڑا دخل ہے کہ صدیوں کے اثرات کے نتائج اتنی جلد زائل نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کا یہ رویہ آزادیٔ خیال کے تعلق سے جدید نسل اور قدیم نسل میں واقع خلیج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے تخلیقی وجود کی اہمیت کو منوانا نہیں ہے بلکہ ان کے اوپر جو سماجی، اخلاقی اور تہذیبی ذمہ داریاں ہیں، ان کو وہ بخوبی سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں تخلیقی معروضیت اپنی روایت کے ساتھ ساتھ مستعار اثباتی قدروں جن کی اصل روایتی قدروں کی تہہ میں ہی کہیں پوشیدہ ہیں، کو محض نقالی کے طور پر تصور نہیں کرتی بلکہ اسے روایتی قدروں سے منسلک کر کے سماجی اور معاشرتی ارتقا کے ایک سلسلے کی صورت میں برتتی ہے۔

اجالوں کے پجاری گا رہے تھے
ہمارے گھر جلائے جا رہے تھے

میں نے پوچھا تری متاع حیات
بولا جہلم میں بہہ گیا سب کچھ

تیری مرضی، نہ دے ثبات مجھے
بے یقینی سے دے نجات مجھے

اپنی غزل کو خون کا سیلاب لے گیا
آنکھیں رہیں کھلی کی کھلی خواب لے گیا
شب زندہ دار لوگ اندھیروں سے ڈر گئے
صبح ازل سے کون تب و تاب لے گیا

فاروق نازکی اپنے اشعار کے توسط سے پرانے عقائد و نظریات کو ضرب نہیں لگاتے۔ عقلی دلائل کی پرستش کا کوئی میکانکی انداز انہوں نے اختیار نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں

باطن کے اسرار کی اہمیت زیادہ ضروری ہے لیکن خارجی سطح پر ذہنی آسودگی کے اسباب بھی رقم کرتے ہیں۔ یہ اسباب ستے ہیجان اور بے معنی مصروفیت کے نتیجے میں برآمد نہیں ہوتے۔ ان کا تعلق فطرت کی ان آوازوں سے ہے جو بے رنگ یکسانیت کی گرفت میں انفرادی صلاحیتوں کے مقید ہونے سے وجود میں آتی ہیں۔ فاروق نازکی نے عقل کو جبلت یا جبلت کو عقل پر ترجیح نہیں دی ہے بلکہ دونوں میں ایک توازن رکھا ہے۔

جب کوئی نوجوان مرتا ہے
آرزو کا جہان مرتا ہے

میرے دھڑ سے ہوا ہے مرا سر الگ
اب کرو میری گردن سے خنجر الگ
میری تقدیر میں دونوں لکھے گئے
تم نے کیوں کر لیے پھول پتھر الگ

عقیدت کی دیوار کچی نہیں
یہ وہ ریت ہے جو بکھرتی نہیں

کبھی نہ رکتا کوئی پا شکستہ میرے قریب
جو سنگ میل نہیں سنگ رہ گزر ہوتا
حیات ایک سہی، کائنات ایک سہی
ہمارے عہد کا انساں بدل گیا ہوتا

فاروق نازکی کے شعری وجود کی پرتیں جس قدر باریک ہیں وہ ان کی ذہنی کشادگی، وسعت نظر اور بالیدگی فکر پر دال ہیں۔ یہ بھی خوش آئند بات ہے کہ آخری خواب سے پہلے (۱۹۹۲ء) اور لفظ لفظ نوحہ (۱۹۹۵ء) کے بعد ان کا تیسرا مجموعۂ کلام ''یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے'' عنقریب منظر عام پر آرہا ہے۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ بھی ان کے اس شعر کے عین مطابق ہوگا۔

پیکرِ وقت میں ڈھل جاؤں گا لمحوں کی طرح
کون کہتا ہے کہ ذہنوں سے اتر جاؤں گا

(فاروق نازکی)

نمونۂ کلام

جب بھی تم کو سوچا ہے
سارا منظر بدلا ہے
جاتے جاتے یہ کس نے
نام پون پر لکھا ہے
انگاروں کے موسم میں
جسموں کا سا میلہ ہے
میری بستی میں آ کر
پاگل دریا ٹھہرا ہے
خوشیاں ہیں مہمان مری
غم میرا ہمسایا ہے
تم کیا جانو کشمیری
دل میں کیا ہوتا ہے

میں چھوڑ آیا تھا اپنے گھر کو، مگر اسی کے خیال میں ہوں
نقوش پائے ہوا نہیں ہوں، میں اپنے ماضی کے حال میں ہوں

بلندیوں پر قیام میرا، ہر ایک بستی میں نام میرا
میں ہر زمانے کی آبرو ہوں، عروج میں ہوں زوال میں ہوں

حصار خوف و ہراس میں ہے بتان وہم و گماں کی بستی
مجھے خبر ہی نہیں کہ اب میں جنوب میں یا شمال میں ہوں

یہاں سے نکلوں تو جان لوں گا، مگر اسیری میں جب تلک ہوں
مجھے بھی اذن جواب دے دے کہ قید اپنے سوال میں ہوں

یہاں کسی کو خبر نہیں ہے کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
اسی کی چشم کرم ہے مجھ پر کہ مست خود اپنے حال میں ہوں

نئی باسی کوئی خبر دے دے
سچی جھوٹی کہ معتبر دے دے
سنگ برسا دے میرے آنگن میں
رہ رووں کو گل و ثمر دے دے
ہے فلک تک فصیل نار جھیم
اے خدا، اب تو ابر تر دے دے
کامیابی مرا مقدر کر
زور کے ساتھ مجھ کو زر دے دے
تابنا کی عطا ہو فرقت کو
کاسۂ چشم میں گہر دے دے
اب فقیری میں کوئی بات نہیں
حشمت و جاہ و کر و فر دے دے

نوک خنجر روز لکھ لیتی ہے اک دفتر نیا
صبح لے آتی ہے اپنے ساتھ پھر محشر نیا
دیکھتے ہی دیکھتے بستی میں لگ جاتی ہے آگ
روز لٹ جاتا ہے کوئی مسکراتا گھر نیا
سنگ باری کے لیے موسم نہیں مخصوص اب
سنگ باری ڈھونڈ لیتی ہے ہمیشہ سر نیا
روشنی آئے بھی کیسے مرے ماتم خانے میں
جن کے بوسیدہ دریچوں میں لگا ہے در نیا
صورت حالات کے بارے میں کیا لکھوں میاں
کوئی منظر نازکی صاحب نہیں منظر نیا

پھر پہاڑوں سے اتر کر آئیں گے
راہ بھٹکے نوجواں گھر آئیں گے
جن کی خاطر ہیں گھروں کے در کھلے
صبح کے بن کر پیمبر آئیں گے
پھر تلاطم خیز ہے دریائے خوں
ہم تری تقدیر بن کر آئیں گے
دوستو! مت سیکھئے سچ بولنا
سر پہ ہر جانب سے پتھر آئیں گے
ہاتھیوں کی زد پہ ہے کعبہ مرا
کب ابابیلوں کے لشکر آئیں گے

اپنی غزل کو خون کا سیلاب لے گیا
آنکھیں رہیں کھلی کی کھلی خواب لے گیا

شب زندہ دار لوگ اندھیروں سے ڈر گئے
صبح ازل سے کون تب و تاب لے گیا

عریاں ہے میری لاش حقیقت کی دھوپ میں
وہ اپنے ساتھ یادوں کا برفاب لے گیا

آیا مرے قریب گل سیم تن کی طرح
سارا سکون صورت سیماب لے گیا

مجھ کو سپرد تشنگی روح کر گیا
وہ اپنے ساتھ بزم مئے ناب لے گیا

کسی کی زلف کا قصہ جو مختصر ہوتا
شب فراق کو اندیشۂ سحر ہوتا
بھٹک نہ جاتا اگر ذات کے بیاباں میں
تو میرا نقش قدم میرا راہبر ہوتا
کبھی نہ رکتا کوئی پا شکستہ میرے قریب
جو سنگ میل نہیں سنگ رہ گزر ہوتا
اگر میں ہار نہ جاتا خود اپنے ہی ہاتھوں
تمہارا داؤں کبھی کوئی کارگر ہوتا؟
فصیل شب سے مرے روشنی کے آنگن میں
ہمارے ساتھ کبھی آپ کا گزر ہوتا

حصار جسم سے آگے نکل گیا ہوتا
جنوں کی آگ میں دیوانہ جل گیا ہوتا

حیات ایک سہی، کائنات ایک سہی
ہمارے عہد کا انساں بدل گیا ہوتا

ہوا کے زور نے پتھر اڑا دیے ہوتے
تمام شہر کو طوفاں نگل گیا ہوتا

میں اپنی نیند کسی گھر میں کیسے بھول آتا
وہ میرے خواب کے سانچے میں ڈھل گیا ہوتا

نہ پوچھ کیسا تھا منظر تری جدائی کا
فرشتہ ہوتا تو وہ بھی دہل گیا ہوتا

میرے دھڑ سے ہوا ہے مرا سر الگ
اب کرو میری گردن سے خنجر الگ

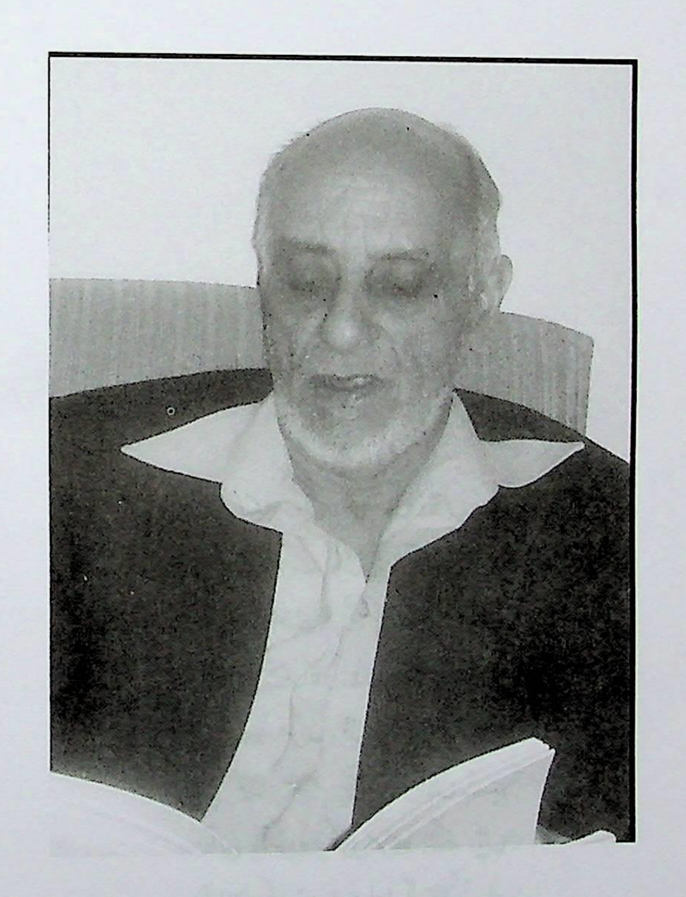
میری تقدیر میں دونوں لکھے گئے
تم نے کیوں کر لیے پھول پتھر الگ

دھوپ حالات کی سینک لی تو ہوا
میری آنکھوں سے خوابوں کا منظر الگ

جب تلک دم میں دم تھا مرے ساتھ تھے
اب مرے دوست رہتے ہیں اکثر الگ

وہی میں ہوں وہی خالی مکاں ہے
مرے کمرے میں پورا آسماں ہے
دیار خواب و چشم دل فگاراں
جزیرہ نیند کا کیوں درمیاں ہے
سکوت مرگ طاری ہر شجر پر
یہ کیسا موسم تیغ و سناں ہے
چمن افسردہ، گل مرجھا گئے ہیں
خزاں کی زد پہ سارا گلستاں ہے
بھلا دی آپ نے بھی وہ کہانی
محبت جس کے دم سے جاوداں ہے

مظفر ایرج



مظفر ایرج کا شعری ادب

مظفر ایرج کے اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے ادبی میلان کے مستحکم تخلیقی رویوں کا سراغ لگایا جائے تو یہ تہذیبی، معاشرتی، فکری اور نفسیاتی عناصر میں مضمر محسوس ہوتے ہیں۔ پوری دنیا بالخصوص وادیٔ کشمیر کے ادھر ۳۰۔۳۵ برسوں میں تبدیل ہوئے اور ادھر ۱۰۔۱۲ سالوں میں تبدیلی کے مراحل میں شدت کے سبب سیاسی، تہذیبی، اقتصادی اور نئے جذباتی ماحول نے زندگی کی جانب چند تازہ کار زاویہ ہائے نظریات کی ترتیب و ترویج کی ہے، مظفر ایرج کی شاعری ان کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ علاوہ بریں ان کے اشعار مختلف دنیاوی موضوعات کے تعلق سے فکر و فن کے ایسے معیار قائم کرتے ہیں جن کی نوعیت اردو کی عام شعری روایت سے منسلک تو ہے لیکن ان میں مظفر ایرج کے مختلف تخلیقی شعور کی آئینہ داری بھی بخوبی ہوتی ہے۔ چند اشعار ؎

مجھ کو سمندروں میں سمانے سے بیر تھا
قطرے سے جان بوجھ کے دریا کیا مجھے

خواہش بھر کب ہاتھ آتا ہے
بس میں تو کچھ لمحات کرو تم

اختلاف خیال لازم ہے
ایک ہی بات کیوں کہے مجھ سے

تم جہاں سے بھی چاہو، پڑھ ڈالو
میرا چہرہ کتاب ہے لوگو

تل تل مرنے والے لوگ بھی ہیں موجود
قطرہ قطرہ دل دریا بھی بہتا ہے

مظفر ایرج نے اپنے اشعار میں جو مشاہدات و تجربات بیان کیے ہیں، ان میں مسلمہ اقدار، روایات اور ذہنی وجذباتی تحفظات سے محرومی کا خوف نظر نہیں آتا۔ بلکہ نئے تصورات سائنس، مذہب، مابعد الطبیعات اور لاشعور کے محرکات سے تقویت حاصل کر کے ان تلخ سچائیوں کو مزید تلخ ضرور بنا دیتے ہیں جنھیں مشینی دور کا عطیہ قرار دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح سماجی کم ظرفی اور ذاتی مفاد پرستی کی حفاظت کی جاتی ہے۔ عالمگیر سطح پر نئی حسیت کی ترجمانی کا یہ نکتہ جہاں ادیبوں اور فنکاروں کو چونکا دینے والا رہا ہے وہیں افکار و اظہار کے مزید نئے منظر نامے کے دروں کو وا بھی کرتا ہے۔ اگر زیریں سطح سے بھی غور کیا جائے تو یہ نیا منظر نامہ پرانے منظر ناموں کی از سر نو دریافت و بازیافت کی جانب اشارے ضرور کرتا ہے اور بالکل ٹھوس دلائل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ چند اشعار۔

یہ تو روبوٹ کا زمانہ ہے
آدمی کی افادیت جا ڈھونڈ

اس کو بھیجا خلاؤں میں ایرج
مجھ سے دو چار دن جدا تو رہے

جو کچھ بھی کشکول میں ہے
بانٹ رے مست قلندر بانٹ

مری ہر بات کو رد کر چکا ہے
میں منصف کو دعائیں بھیجتا ہوں

اپنے دامن میں سمٹتیں گے کہاں
روشنی پیکر نہیں، سایا نہیں

مظفر ایرج ذات وکائنات کی جانب جو تخلیقی طرز نظر اختیار کرتے ہیں، وہ صنعتی تمدن، مادی آسودگی اور روحانی فقر کے عالم گیر اور پیچیدہ سلسلوں کے بیانات میں وہ پیچیدگی اختیار نہیں کرتی جو شخصی تجربۂ محض بن کر رہ جائیں۔ اور انہیں ذاتی یا موروثی انسلاک کے علاوہ قبول کرنے میں آمادگی مجبوری محسوس ہو۔ بلکہ موجودہ عہد کے شعور اور وقت کے حصار میں گھرے ہوئے انسانوں کی عارضی

الجھنوں سے لے کر ابدی الجھنوں کے بعض پہلوؤں پر بھی اظہار خیال ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ انسانی توانائی کی جانب آزادانہ اور مقصود فی النفس مظہر کی مانند ذہن کو راغب کرنے کے لیے بعض مقامات پر مظفر ایرج نے فلسفے کی ہیئت کو صیغۂ اظہار میں منتقل کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور کافی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو ان کے تخلیقی وجدان کی راہ جدید فلسفیانہ اثاث کی راہوں سے جاملتی ہے۔ دوسری طرف نئی شاعری جس کے نشانات فرد اور سماج کے داخل اور خارج میں گردش کرتے منتشر عناصر میں پیوست ہیں، ان کی تخلیقی منزلوں کا پتہ بھی دیتے ہیں۔

میں تو پہاڑوں تک آیا تھا تیرے لیے
تو تو چھپا ہے میرے اندر فتنہ کناں
ایک طرف ایرج بیچارہ بند انا
ایک طرف اعمال کا دفتر فتنہ کناں

جھولیاں بھر بھر کے دیں لیکن میں ہوں دامن تہی
میں نے مانگا تھا سکوں، لعل و گہر دے کر گیا
عشق کے رن میں کھڑا تھا میری گردن کاٹنے
اتنا لاپرواہ تھا، اپنا ہی سر دے کر گیا

یاد کا بھی عجیب عالم ہے
جب نہ آنا اسے تھا، جب آئی

مظفر ایرج کے یہاں زبان و بیان اور استدلال کا جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے، وہ ان کے فکری سرمائے میں نئی حسیت سے وابستہ شاعری کے انہیں عناصر کو جگہ دیتا ہے جنہیں اہم اور معتبر شعرا کے حلقوں میں اعتبار حاصل ہے۔ ان کے افکار کا خاکہ شعری سرمائے میں اگر نئی نہیں تو مختلف تخلیقی اور فکری فضا کی تعمیر میں اہم کردار ضرور ادا کرتا ہے۔ انہوں نے افکار و اظہار کے مختلف زاویوں کو اپنا کر معاصر عہد کی تخلیقی فکر کے مستحکم میلان میں جذباتی، نفسیاتی اور فکری منظر نامے کی مابین رابطے کی جو مسلسل کوشش کی ہے، ان میں شعری مواد کی اہمیت بہت اہم ہے۔ انہوں نے ہر ممکنہ کوشش کی ہے کہ سماجی مسائل کے متعلق مشاہدہ براہ راست ہو۔ واقعات کے مطالعے کے پس منظر میں جو مشاہدہ براہ راست ہوتا ہے اس کی بھی اپنی اہمیت یقیناً مسلم ہے لیکن وہ مشاہدہ جو ذہن و فکر میں موجود پہلے سے

طے شدہ خاکوں کی حدود میں داخل نہ ہو کر اپنا خاکہ خود تیار کرے وار اس سے تخلیقیت کی ایک الگ راہ کا تعین ہو تو اس کی اہمیت اور ہے۔ مظفر ایرج نے دونوں طرح کے مشاہدوں سے اپنی تخلیقات کو مزین رکھا ہے۔ لیکن مشاہدے کا فرق بھی الفاظ کے انتخاب اور زبان کے اسلوب سے واضح ہے۔

کر کے طے مرحلے اداس تھا وہ
جیت ہی اس کی ہار ہے شاید

کھولی گئی ہے لاش، شکایت نہیں مجھے
اب کس مزار کا کوئی پتھر ہے سلامت

میں نے سوچا ہے بہت دور نکل کر دیکھوں
اس سے پہلے کہ خبر لے کے کبوتر آئے

اپنے بوجھ سے ٹوٹ رہا ہوں
میں بھی کانچ کا اک ٹکڑا ہوں

روشنی کو نہ اور پھیلاؤ
اس طرح ہوگا تیرگی کا خون

مظفر ایرج کی شعری ترجیحات میں دنیا کے عمل اور رد عمل کے طور پر بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کی ابتدا کے حالات کا خاص مقام و مرتبہ ہے۔ نئی حقیقتوں اور نئی شخصی اور اجتماعی صورت حال کے سیاق میں نقطۂ نظر کے اظہار کی ہیئت کو شعری مضمون کے ساتھ ایک ادبی حیثیت کا حامل بنا دینا آسان عمل نہیں ہے۔ یہ ذہنی اور تخلیقی رویہ کبھی اشاریہ اور کبھی واضح تخلیقی عمل کے طور پر مظفر ایرج کے اشعار میں رواں دواں ہے۔ انہوں نے فرد کے ذہنی ارتقا کے خارجی مظاہر سے ہی اپنی تخلیقی اثاث کو مشروط نہیں کیا ہے بلکہ ذہنی ارتقا کے داخلی مظاہر اور اس کے عمل اور رد عمل کے نتیجے میں سماج اور معاشرے کے ارتقا اور زوال کے عناصر کو بھی نشان زد کیا ہے۔

ہوں تیرگیٔ شب کے مقدر کی طرح چپ
آزر کی ہر اک ضرب پہ پتھر کی طرح چپ

کہتا رہا دنیا سے میں خود اپنی حکایات
خوشبو کے کسی بولتے منظر کی طرح چپ

میں تو آؤں گا مگر پھر سے بچھڑنے کے لیے
خط میں پردیس سے اک شخص نے جا کر لکھا

چلے تو زاد سفر تھا نہ منزلوں کا پتہ
وہ سر پھرے تھے، ہوا بھی تھی سر پھری اب کے

ڈرتے ڈرتے بچھا تو دی ہم نے
دل کی بازی الٹ نہ جائے کہیں

مظفر ایرج کے اشعار سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ عصری حسیت سے تعلق رکھنے والے مواد اور موضوعات کو ایک خاص مقام کا حامل تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اسے زندگی کی سب سے اہم قدر تصور نہیں کرتے اور نہ ہی ایسا کوئی دعویٰ کرتے ہیں کہ عصری حسیت کے موضوعات تک ہی اب عظیم شاعری کے امکانات محدود ہیں۔ بلکہ جدید حسیت جس کا گہرا تعلق صنعتی تہذیب سے ہے، تو ایسے میں خوف، تنہائی اور اس کے ردعمل کے نتیجے میں احساس جرم اور انتشار کا در آنا لازمی ہے۔ ظاہر ہے کہ آج کے صنعتی دور کے پہلے بھی یہ تمام احساسات موجود تھے لیکن نوعیت بدلی ہوتی تھی۔ تو اس بدلی ہوئی نوعیت کے ساتھ جو تخلیقی عمل ہوتا ہے وہ خاص تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے ہی عظیم تسلیم کرنے کا جواز کہیں سے نہیں بنتا۔ عظیم شاعری کے تمام عناصر آفاقی ہوتے ہیں اور زیادہ تر ان کی تعین قدر میں بھی مظفر ایرج کو ان تمام کی پوری خبر ہے اور وہ ان تمام نقطۂ ہائے نظریات کو تخلیقی ذہن سے منسلک رکھتے ہیں اور ان کا تخلیقی عمل مستقبل کی روشن اقدار کی بھی نشاندہی بعض صورتوں میں کرتا ہے۔

خبر یہی ہے وجود کی بے بضاعتی کی
سمندروں کی تلاش مت کر سراب چن لے

ست یگ میں رام جی بھی پرکشا میں پڑ گئے
سیتا ہرن ہوا تو چھپائی نہ دل کتاب

ہے انتشارِ جاں سے پرے تنگنائے ذات
دونوں کے امتحاں کا سبق میں نہ پڑھوں گا

بسائیں کتنی بھی ہم بستیاں خلاؤں میں
اٹھے ہیں خاک سے، رہنا تو ہے سرابوں میں
وہ لخت لخت تو اترا تھا خون میں ایرج
میں اس کی کھوج میں ہوں اپنے ہمنواؤں میں

مظفر ایرج کی نظموں کے تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ان کی نظموں میں وسعت سے بڑھ کر امکانات ہیں۔ اس خیال کی روشنی میں اگر مظفر ایرج کی نظموں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو ان کے لیے علیحدہ مضمون درکار ہے، لیکن اس مضمون میں ان کی نظم گوئی کا ذکر تک نہ کرنا میرے خیال میں ادبی دیانت داری نہ ہوگی۔ لہٰذا تفصیلی مضمون کو اگلے وقتوں کے لیے اٹھا رکھتے ہوئے مختصر طور پر کچھ عرض کر دینے سے میرے خیال میں ادبی فرض کی ایک حد تک ادائیگی ہو سکتی ہے۔

مظفر ایرج نے طویل اور مختصر دونوں اسلوب میں نظمیں کہی ہیں۔ لیکن ان کی مختصر نظم بھی کم از کم دو صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ مظفر ایرج نے اپنی نظموں میں حالات کی تعبیر کرنے اور اس کی ترجمانی کرنے کے لیے رمز و علامات کا جو سہارا لیا ہے اس سے ان کی ذاتی حس میں وہ وسعت پیدا ہوگئی ہے جو شاعر کے ذہن کو بٹنے نہیں دیتی، وہ سیاست کے قرب سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔ کئی مخصوص بصیرت پر اصرار اس کی تخلیقی حسیت کے خلاف ہے۔ وہ ماضی کے تعلق سے وہی رویہ اختیار نہیں کرتا جو تاریخی کتابوں میں درج ہے بلکہ تاریخی واقعات پر غور کرتے ہوئے ممکنات اور غیر ممکنات کی سطح پر اپنے شعور و ادراک سے کام لیتا ہے۔ ان کی ایک نظم 'اجتہاد' ان کے اس شعور و ادراک کی بہترین نمائندگی کرتی ہے۔

آگ
پانی سے
ہوا سے
اور
مٹی سے اٹھایا جا چکا میرا خمیر
میں

انا الحق
بولنے کی استطاعت ہی
نہیں رکھتا
تو
کیوں کر قتل ہو جاؤں
میں
سچ کا زہر پی کر
کس لیے
سقراط کہلانے کی ضد کرلوں
مجھے
انساں ہی رہنے دو
مجھے تو
ابن آدم کی طرح
دنیا میں جینا ہے
بہت دن تک
کہ
مجھ کو
آدمی کی کوکھ میں
خواہش کا
میٹھا زہر
بونا ہے!! (اجتہاد)

مظفر ایرج نے نظمیہ شاعری میں موضوعاتی سطح پر اسلوب کی صورت میں بعض جگہوں پر اپنی ایجاد کا ثبوت فراہم کیا ہے۔نظمیہ آہنگ کو برتنے کے لیے انہوں نے روایتی فارم کے آہنگ کو نظر انداز کیا ہے۔ وہ اپنے بیان میں اس قدر الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں کہ ان کا بیان فطری معلوم ہوتا ہے۔نئی شعری زبان اور اس کے آہنگ کو اپنانے کے سبب ان کے یہاں سنجیدہ الفاظ میں طنز بھی ہوتا ہے۔ایک خاص بے بسی کی آئینہ داری بھی ہوتی ہے اور فانی کے اس شعر۔

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوروں کی روح
خیر جو چاہا کیا لیکن بتا ہم کیا کریں

کے اعتبار سے سوالات بھی ابھرتے ہیں۔ لیکن اپنی بیشتر نظموں میں مظفر ایرج نے ان کے جوابات تلاش نہیں کیے ہیں۔ یہ بھی ان کے فن کا ایک کمال ہے۔ ان کی ایک نظم 'ہونی' اس تعلق سے لاجواب نظم ہے۔

اور
پھر اس رات
اس
آدھے ادھورے آدمی نے میری
مردہ کوکھ میں
کچھ پھول چہرے
چاند جھومر
بودیے تھے
جن کی خوشبو
اور جن کی
دھوپ آہٹ کا ہے
اب تک
شہر کے
قاضی کا فتوئ منتظر (ہونی)

مظفر ایرج نے اپنے شعری بیان میں ایسے کسی عقیدہ کا سراغ نہیں دیا ہے جو ان کے فن کو اپنے حصار میں قید کر دے۔ ان کے شعری وجود کا معنی ومقصد دونوں ہے لیکن وہ کسی لادے ہوئے فلسفے، سیاست، منفی اخلاقیاتی عناصر جو دیکھنے میں کچھ اور عمل کرنے میں کچھ ہوں، سے کوسوں دور ہیں۔ انہوں نے کائنات کو سمجھنے اور سمجھانے میں اپنی مٹی کے حالات، ماحول اور اپنی ذات کے عرفان کا سہارا لیا ہے اور اس طرح انہوں نے اپنے تجربات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ یہ تجزیہ جہاں ان کے واضح اور علامتی اظہار کے لیے مفید ثابت ہوا، وہیں شعری وجدان تک پہنچنے کا ایک وسیلہ بھی کہ جہاں آپ بیتی، جگ بیتی بن جاتی ہے اور کائنات کے تمام راستے ذات سے ہو کر گزرتے ہیں۔ مظفر ایرج کی ایک نظم 'انکشاف' ہے

جو بڑی موثر اور ذات سے کائنات اور پھر کائنات سے ذات تک کے سفر کی عمدہ مثال ہے۔

یہ جان کر بھی
کہ
تو رگ وپے میں دوڑتا ہے
میں
نیلے گنبد کے نیچے تیری تلاش میں ہوں
میں جب سے بچھڑا ہوں اپنے ریوڑ سے
دشت و دیار میں، خارزاروں میں، ظلمتوں میں
بھٹک رہا ہوں
کہ
میں بھی امکاں کی سرحدوں میں اسیر جاں ہوں
میں
تیری مخلوق میں نیم وحشی ہوں، بے ہنر ہوں
مگر تو خالق ہے مہرباں ہے
تو
دست قدرت سے میری وحشت کو مات دے دے
سمندروں کو حیات دے دے
میرے جنوں کو ثبات دے دے
کہ
تو رگ وپے میں دوڑتا ہے (انکشاف)

مظفر ایرج کی نظموں کا زیادہ تر علامتی اور استعاراتی انداز ظاہر کرتا ہے کہ ان کے نزدیک روایتوں اور تاریخی واقعات اور موجودہ سانحات کی کیفیتوں کا صاف، واضح اور براہ راست اظہار جہاں بہت سے ظاہری خطرات کو راہ دیتا ہے وہیں تخلیق کار کی تخلیقی حسیت کے متعلق بھی ایک طرح کا مغالطہ پیدا کرتا ہے۔ اس طرح اس کا باطن بھی ایک طرح نا کردہ گناہ کے انتشار سے مضطرب رہتا ہے۔ اس کے برعکس علامتی اسلوب میں بعض اوقات ان لمحات کی بہترین مصوری بھی ہاتھ آجاتی ہے جو بعد کو ایک واقعے یا ایک داستاں کی شکل اختیار کر تاریخ بناتے ہیں اور دنیا کے عظیم افکار میں اپنا مقام

ومرتبہ بھی متعین کرتے ہیں۔ مظفر ایرج کی ایک نظم 'دائرے' ہے جو علامتی اسلوب میں ایک مبہم سی فضا قائم کر کے بھی اہل نظر کے لیے حقیقت اور عبرت دونوں فراہم کرتی ہے۔

کوئی
ٹوٹے ہوئے کھلونوں میں
اپنے ماضی کو قید کر آیا
کوئی
کاغذ کے پھول چن چن کر
حال کی خوشنما فصیلوں میں
اپنے زندہ لہو کے چھینٹوں سے
ایک عنوان دل تراش آیا
کوئی الجھی ہوئی لکیروں میں
اپنے چہرے کو ڈھونڈتا ہوگا
(کل کوئی ہو نہ ہو خدا جانے)
وہ فسانہ سہی، فریب سہی
یہ حقیقت ہے
تلخ یا شیریں،
اہل دانش ہوں یا مفکر ہوں
سب ترے شہر کے چوراہے پر
اپنے افکار بیچ آئے ہیں (دائرے)

جن نظموں کا حوالہ میں نے اوپر پیش کیا ہے وہ محض ایک تعارف بھر ہے۔ مظفر ایرج کی شہرۂ آفاق نظموں میں ہوا دشت دیار، اعتراف، تیسری سوچ، مسیحا کی واپسی، وردان، حل طلب، مکینوں کی تلاش، بیٹ، ادراک، کنفیشن، واپسی اور اس قسم کی متعدد نظمیں ہیں جن پر گفتگو لازمی ہے، جن پر میں اپنے آئندہ کے مضمون میں اظہار خیال کروں گا۔

مظفر ایرج کے خیالات کی ندرت نے شعریات کے اہم عناصر مثلاً مضمون آفرینی، معنی آفرینی، خیال بندی اور اختصار وغیرہ سے منسلک ہو کر ان کی شاعری کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کوئی شبہ نہیں کہ ان کی شاعری ادب میں مزید بلند مقام و مرتبت کی منزلوں کو سر کرے گی۔

نمونۂ کلام

خلا بستی زمیں کیا! آسماں تک
یقیں کی سرحدیں پھیلیں گماں تک
میں اپنی ذات کے امکان میں ہوں
شنیدہ، ناشنیدہ لا مکاں تک
نہ ممکن لفظ کی تفسیر کوئی
نہ کوئی حرف پہنچا داستاں تک
نفاست رنگ، تتلی پھول، خواہش
سفر اندر سفر دیوار جاں تک
غضب! میں بھی سرابوں کا مسافر
عجب! میں آ گیا خود ہی یہاں تک
تجسس! زندگانی کی علامت
تعقل! حادثے کے امتحاں تک
میں سمتوں میں سمٹ جاؤں گا ایرج
مری تجدید ہو ممکن کہاں تک

نہ ابتدا نہ کوئی اس کی انتہا ہوگی
کہانی میری ہر انداز سے جدا ہوگی

ترستے لب، لب ساحل پہ منتظر ہوں گے
سلگتی آنکھ تصور سے ماورا ہوگی

الٰہی وصل کا ان کو بھی کچھ سلیقہ دے
ہمارے ہونٹوں پہ اب کے یہی دعا ہوگی

وہ مجھ سے چھین گیا ہے مرے خیال کے پھول
بھلا اب اور اچنبھے کی بات کیا ہوگی

نہ جھانکنا نہ کسی اور کو جگا دینا
تمہارے در پہ اگر رات کو صدا ہوگی

بھٹکتے لوگ ہیں یا سایہ سایہ دیواریں
یہ دھوپ ساتھ چلے کچھ تو آنکھ وا ہوگی

بٹھائے پانی پہ ایرج کسی نے پھر پہرے
سنا ہے شام اترتے ہی کربلا ہوگی

اگلی مراد حرف دعا تک نہ آئے گی
یا لامکاں سے میری صدا تک نہ آئے گی

میرا وجود خاک میں ملنے کی دیر ہے
کہتے ہیں اس زمیں پہ ہوا تک نہ آئے گی

ایسا فسوں زدہ جو رہا ضابطۂ قرب
جسموں سے اب کے بوئے قبا تک نہ آئے گی

مقتول آپ اور میں قاتل بھی آپ ہوں
یہ مثل ذات جرم و سزا تک نہ آئے گی

جتنی اٹھا سکوگے اٹھاؤ فصیل شام
ورنہ حیات شب کی ردا تک نہ آئے گی

ایرج سمیٹ خود کو نہ اپنے ہی خول میں
یہ احتیاط چشم رسا تک نہ آئے گی

گو لاکھ کہیں گردش حالات میں گم ہیں
سچ ہم سے سنو لوگ خرافات میں گم ہیں
جذبوں میں حرارت نہ شفق ذات میں سرخی
پتھر کی طرح ارض طلسمات میں گم ہیں
سورج ہی ہے ہاتھوں میں نہ ہی چاند جبیں پر
کیا بات ہے کچھ کہیے کہ کس بات میں گم ہیں
اب ہوتی نہیں ہم سے کناروں کی تمنا
گرداب کی صورت سفر ذات میں گم ہیں
لے جائیں کہاں کس کو حوادث کے تھپیڑے
محفوظ ہیں ہم ایسے سوالات میں گم ہیں
جب ہوگی ملاقات نہ ہو جائے قیامت
اچھا ہے کہ ہم ایسے خیالات میں گم ہیں
تقدیس ہنر، شاخ شعر، کاسئہ ایرج
صدیوں سے سوالات و جوابات میں گم ہیں



اس واردات خون سے وابستہ میں ہی ہوں
یعنی خود اپنی موت پہ آمادہ میں ہی ہوں
مجھ سادہ دل کو اپنے پرایوں نے لوٹ کر
الزام دے دیا ہے جہاں دیدہ میں ہی ہوں
اچھا ہوا کہ ٹوٹ گیا میرا اندروں
مجھ کو کہاں خبر تھی کہ شائستہ میں ہی ہوں
اس شہر انتشار میں آیا تو کھل گیا
ورنہ مجھے یہ زعم تھا پیچیدہ میں ہی ہوں
بکھری ہوئی حیات سے جزیات کی طرح
خوشبو سمیٹنے پہ کمر بستہ میں ہی ہوں
ہو ضد انہیں نہ کھینچے کوئی ان کے خد و خال
توڑے مجھے کہ وقت کا آئینہ میں ہی ہوں
ایرج! نہ رسم ورہ، نہ تخاطب، نہ ذوق وصل
یہ سانحہ ہے آپ کا دیوانہ میں ہی ہوں

آنے والے لمحوں کو پہچانتے ہیں
لوگ بڑے نباض ہیں سب کچھ جانتے ہیں
موسم صورت رنگ بدلتے ہیں اپنا
وقت پڑے تو باپ کو خر گردانتے ہیں
اتنے بے پروا ہیں ہم سب قدروں سے
دولت کی چھلنی میں رشتے چھانتے ہیں
اپنے اپنے خول میں چاہے چھپ جائیں
موت کی زد پر ہیں اتنا وہ مانتے ہیں
دل دہلیز پہ جب چلتی ہے پروائی
ہم اپنی یادوں کی چادر تانتے ہیں
اب دنیا میں پیار سے رہنا ہے مشکل
ایرج ایسے سادہ دل بھی جانتے ہیں

میری بستی میں بھی آکر دیکھتے
حشر سے پہلے ہی محشر دیکھتے

سب کے ہاتھوں میں کھلونے موت کے
سب کی آنکھوں میں یہی ڈر دیکھتے

تم نے چومے ہیں حسیں چہروں کے پھول
آستینوں میں بھی خنجر دیکھتے

ہم بھی دے پاتے اگر سورج کا ساتھ
ہم بھی دن ڈھلنے کا منظر دیکھتے

کوئی سایہ ہے نہ کوئی روشنی
تیرگی دیوار و در پر دیکھتے

ہے شکست و ریخت ہر شئے کا مال
جو ہے برتر سو ہے کمتر دیکھتے

اب بھی ہے صحرا نوردی کا شکار
اب تو ایرج کے لیے گھر دیکھتے

اپنا آپ ہی ارپن کرنے آیا ہوں
سب کو اپنا دشمن کرنے آیا ہوں
اپنی آنکھوں اور تمہاری اکھیوں میں
رم جھم رم جھم ساون کرنے آیا ہوں
دل دریا ہو یادریا دل ہو کوئی
ہر ہردے کو درپن کرنے آیا ہوں
پیش روؤں سے حلف اٹھا کر لالچ کا
دھنوانوں کو نردھن کرنے آیا ہوں
دن دربار میں کچے سیبوں کی چوری
زندہ اپنا بچپن کرنے آیا ہوں
چوس کے سب آلودگیاں ماحول سے میں
خارستان کو گلبن کرنے آیا ہوں
اس مردہ بستی کے سب فنکاروں کی
دل دھڑکن میں چھن چھن کرنے آیا ہوں
نقلی چہرہ منہ پہ سجانے والوں کی
اصلی صورت روشن کرنے آیا ہوں
چھین کے اس سے اس کی سوچوں ک زنار
ایرج سے میں ان بن کرنے آیا ہوں

ہر بازار کا رائج سکہ رسد و طلب کی مجبوری
جیسے بات بنانے میں ہے ذہن کی، لب کی مجبوری

عزت داروں کے دستار اچھالے دنیاداروں میں
کچھ اس کی فطرت ہی یہی ہے کچھ منصب کی مجبوری

بجھتے چراغوں کو لے دے کر گھر کو روشن کرتے ہیں
اہل حزیں کا خون جلانا اہل طرب کی مجبوری

اک دوجے کی نقطہ وری کو لاعلمی کہتے ہیں لوگ
اک دوجے کے عیب گنانا ہے ہم سب کی مجبوری

میں دامن پھیلاتا ہوں تم منہ کیوں ٹیڑھا کرتے ہو
قیس نے بھی کی کاسہ کشائی، ہے یہ جب کی مجبوری

آج کو کل کرنے کی دھن میں سب ہی تاک لگائے ہیں
اپنی ساعت میں جینا ہے آج نہ تب کی مجبوری

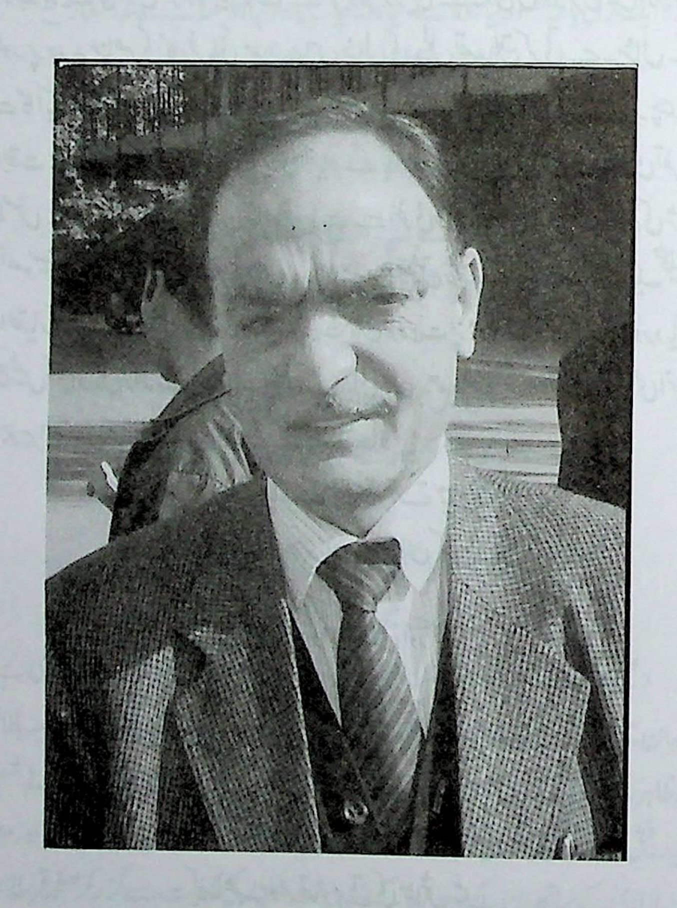
گھر سنسار چلانا بھائی اب تو گورکھ دھندہ ہے
سب افراد کو خوش رکھنا ہی ہے صاحب کی مجبوری

ہم نے نیرو بھی جھیلے ہیں اور محمد تغلق بھی
ہر سرکار تھی راجاؤں کے نام و نسب کی مجبوری

تم دانشور کہلاتے ہو ایرج کچھ ادراک بھی ہے
تم سے کم فہموں کو جلانا علم و ادب کی مجبوری

ہم بھی ہم باخدا افعی سیرت
کچھ کسر ہے تو کینچلی کی ہے
قتل ہوتے ہی کہہ دیا حلفاً
یہ ادا بھی تو سادگی کی ہے
جو ہے کچرے میں منہ چھپائے ہوئے
اس میں بو باس آدمی کی ہے
میرے افکار بیچنے کی بات
اس صدی کی کہ اس صدی کی ہے
ہم نے نروان کے لیے ایرج
جانے کس کس کی بندگی کی ہے

رفیق راز



رفیق راز کے تخلیقی زاویے

رفیق راز کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی تخلیقی فکر اپنے ادبی میلانات کے حوالے سے خود کو جدیدیت کی ادبی فکر اور میلانات سے مربوط کردیتی ہے۔ ان کی شاعری میں ارادی اور غیر ارادی طور پر جدید عناصر کی کارفرمائی میرے اس خیال کی مدلل تصدیق کرتی ہے۔ مثال کے طور پر جدیدیت کا ایک اہم عنصر وجودیت کا فلسفہ ہے جسے مغرب اور مشرق دونوں جگہوں پر چند خیالات سے مطابقت ہو کے بھی مختلف مقامات پر کلی بنیاد کے باوجود شرح و تعبیر میں بڑی بڑی تفریقات کا اعزاز حاصل ہے۔ چونکہ رفیق راز ان تمام نظریات سے بخوبی واقف ہیں، اس لیے ان کی شاعری کی انفرادی خصوصیتیں بھی اس میں ضم ہوگئی ہیں اور اس طرح رفیق راز کے یہاں یہ فلسفہ ایک تخلیقی جہت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ جدیدیت میں فردیت پر جو سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، اس کی مثالیں بھی رفیق راز کے یہاں بہ کثرت مل جاتی ہیں۔ حمد و نعت کے اشعار میں بھی انہوں نے اپنا تخلیقی جوہر استعمال کیا ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار ۔

اب بھی اس پار کے منظر نظر آتے ہیں مجھے
خاک امید کو کچھ اور پریشاں کر دے

رہا ہے تیرے سوا دل میں اور کیا باقی
کہاں گئے وہ تمنا و خواب یا باقی
عجیب منظر سفاک بے کسی کا ہے
لبوں پہ مہر ہے آنکھوں میں التجا باقی

کیسا شبہ سوار تھا، برق کی تلاش میں
کائنات کو غبار سے غبار لکھ گیا

کھلتی ہے آنکھ جلتے مکانوں کے درمیاں
لگتی ہے آنکھ پڑھ کے فسانے ثمود کے

ان اشعار سے واضح ہے کہ رفیق راز نے حمد ونعت کے حوالے سے بھی عاجزی اور انکساری کا جو عمل پیش کیا ہے وہ ایک طرح سے کائنات میں انسان کی فضیلت کی ضمن میں انسان کے اعمال اور مقاصد کی جانب بھی توجہ منعطف کراتا ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں اپنی سماجی وجودیت اور دینی وجودیت دونوں کو معاشرے کے ایک ہی محور پر گردش کرنے کا عمل تسلیم کیا ہے۔ رفیق راز اپنے تخلیقی رویے میں فکر اور ہیئت کے درمیان کہیں دوری بنائے رکھتے ہیں اور کہیں اس دوری کو ختم کر کے ایک اکائی کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ ان کا فنی شعور اور لسانی بصیرت بھی اس کا ثبوت دیتے ہیں۔ تخلیقی عمل کا ایک ترقی یافتہ تصور کیا ہوتا ہے، کیا ہونا چاہیے اور کیا ہو سکتا ہے۔ چند اشعار۔

آنکھ میں پیہم ہوائے دید کا محشر بپا ہے
خاک اڑتی ہے برابر منظر بے منظری کی

لمس کے تپتے ہوئے صحرا میں رات
پیاس بھی تھی بارش رحمت بھی تھی

آنکھوں میں بھڑکتے ہوئے شعلوں نے کیا کام
منظر کو دھواں ہونے کی چاہت بھی نہیں تھی

آگ کا دریا بھی ہے، عقل بھی ہے، عشق بھی
میں ہی تذبذت میں ہوں، میں ہی ہوں تیار بھی

رفیق راز نے اپنی شاعری میں لطیف تر جذبات واحساسات کو بہت کم جگہ دی ہے۔ ایسے موضوع بیان میں بھی کہیں کہیں حالات کی سختی تخلیقی ذہن پر غالب آ گئی ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا شعر نمبر ۲ اور ۴ سے ظاہر ہے۔ ایک تیسری صورت بھی ان کے یہاں علامت کی تہہ میں پوشیدہ ہے۔ (شعر نمبر ۵) دراصل یہ رفیق راز کے تخیل کی بیتاب لہروں کا کمال ہے۔ شعور ولاشعور میں جمع تجربات اور مشاہدات پوری قوت ارادی کے ساتھ ان کے وجدان کے پس پشت اظہار کی کیفیت سے گزر کر صفحہ قرطاس پر اپنی جگہ بناتے ہیں۔ اپنے اردگرد کے ماحول اور حالات نے ان کے شعری وجدان کو جو ایک نیا رجحان دیا ہے۔ وہ بھی ان کی شاعری میں ہو رہی مختلف تبدیلیوں اور تجربہ کاری کے راستے ہموار کرتا ہے۔ یقیناً اپنے ماحول اور حالات کا اثر شاعر کے تخیل پر ہوتا ہے۔ لیکن جب اس کے پس منظر میں ساری دنیا کے حالات کو

آئینہ بنادیا جائے یعنی جب ذات میں کائنات کے ضم ہونے کا عمل شروع ہو جائے تو پھر شعری اظہار ذاتی یا اردگرد کے ماحول اور حالات تک محدود نہ رہ کر آفاقی تناظر اختیار کرلیتا ہے۔

ایک عجب آگ منظروں میں لگی تھی
شعلے نہ تھے ابر گوں دھواں بھی نہیں تھا

اونچے پربت کا پتہ تم سے ہر اک پوچھے گا
گہری کھائی کی طرف ہاتھ اٹھائے جانا

ہم خاک کف پائے نگاراں تھے بصد شوق
ان تیز ہواؤں کے حوالے نہ ہوئے تھے

گرجتا ہوا قلزم بے کراں کا سماں ہر طرف
لکھ نہ دے پیاس کی چلچلاتی ہوئی داستاں ہر طرف

میں خود ماضی ہوں یا ماضی مرا ہے ساتھ میرے
لگا ہے داغ اک ایسا کہ مٹتا ہی نہیں ہے

ان اشعار میں آگ، منظر، شعلہ، دھواں، پربت، کھائی، تیز ہوا، گرجتا ہوا قلزم اور ماضی جیسے الفاظ جہاں ان کے اردگرد کے مخصوص ماحول اور حالات کی ترجمانی کرتے ہیں، وہیں آفاقی سطح پر اپنی علاماتی اور استعاراتی جہات اختیار کرلیتے ہیں، جن کا تعلق کسی بھی ملک اور کسی بھی قوم سے ہو سکتا ہے۔ یہ تجربے جدید ذہن کے ڈکشن، ہیئت، مواد، اسلوب اور تکنیک کی نوعیت کا جہاں پتہ دیتے ہیں، وہیں ان کے تجربوں اور تبدیلیوں کا تخلیقی سطح پر دفاع بھی کرتے ہیں۔ عنوان چشتی کے مطابق:

''ہر رجحان نے شاعری کے دائرے میں کسی نہ کسی قسم کی تبدیلی اور تجربے کو فروغ دیا ہے۔ عشق کے روایتی تصور میں تبدیلی کا رجحان غزل میں حقیقت پسندی کا رجحان، عشق کے ارضی وجسمانی تصور کا رجحان، اجتماعی اور سماجی شعور کا رجحان، وطن پرستی کا رجحان، سیاسی رجحان، اشتراکی رجحان، اصلاح کا رجحان، نئی دنیا کی تشکیل کا رجحان، روحانی رجحان، جنسی وجسمانی

نیز مناظر فطرت کی عکاسی کا رجحان، فراریت کا رجحان، طنز و مزاح کا رجحان، پیروڈی کا رجحان اور تجرباتی رجحان وغیرہ ایسے رجحانات ہیں جو اردو شاعری کی شریانوں میں خون بن کر دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جنہوں نے شاعری کو داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر تبدیلی اور تجربوں سے روشناس کیا ہے۔''

اگر پیروڑی کے رجحان کو نظرانداز کردیا جائے تو باقی تمام کا تعلق رفیق راز کی شاعری سے ہے۔

ہر طرف اس شہر میں اک سنگ باری ہو رہی ہے
میں کہ ہوں زد میں بھی اور محفوظ بھی اک آئینے میں

کچھ تو اس کے ہونے کی ہر طرف خبر پھیلے
اے ہوائے صحرائی خاک ہی اڑا اس کی

آہنگ لاشریک لہ، ہر نفس میں ہے
جو بن کے ایک موسم اسرار مجھ میں ہے

اس قلندر میں بات کچھ ہے ضرور
راکھ ملتا ہے جسم خاکی پر

بارش اثر کی آئے گی تاخیر سے میاں
ہفت آسماں کے سیر کو نکلی ہے میری آہ

رفیق راز اپنی شاعری کے لیے عہد جدید کے ان موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو مختلف ڈکشن، ہیئت اور آہنگ کے اعتبار سے کچھ نیا اور انوکھا کرنے کی قوت اپنی لسانی تشکیل میں رکھتے ہیں۔ اس کے لیے رفیق راز سے مغربی اور دیگر مشرقی زبانوں کے ادب کے براہ راست مطالعے اور تراجم کے سرمائے کے مطالعے سے بھی نئے امکانات اپنی شاعری میں پیدا کیے ہیں۔ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو کی روایتی شاعری بالخصوص صوفیانہ شاعری سے بہت گہرا اثر لیا ہے۔ لیکن اپنے مشاہدے اور ادب میں لسانی اور تخلیقی سطح پر ہو رہی تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جس جرأت مندی

سے انہوں نے شاعری کے مروجہ روایتی پیکروں میں تبدیلی کا سراغ لگایا ہے، اس نے آنے والی نسلوں کے لیے بھی نئی روشنی پیدا کی ہے۔ اس طرح ان کی شاعری کو نئی جہت کی طرف اٹھائے گئے مثبت قدم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

پانی سراب فکر کی موجوں سے دستیاب
سایہ کیے ہوئے ہے مسافر پہ گرد راہ

خوف خزاں تو رہتا ہے ہر موسم میں سر سبز مگر
ایک ہری آواز پہ اکثر زردی چھائی رہتی ہے

روشنی میں ہے تر فقیر کی چپ
اک شعاع فلک نوردسی ہے

ایک نئے انصاف کا منظر ابھرے گا
ڈوبنے والوں میں ہوگا تنکا تقسیم

یوں تو میں نے خواب کئی دیکھے ہیں، دکھائے کچھ اس نے
رات کے خواب نے لیکن دہشت روح میں پھیلا رکھی ہے

رفیق راز نے ردیف، قافیہ کی داخلی اور صوتی تبدیلیوں پر بھی خاصی توجہ کی ہے۔ جس کی مثال ان کے مجموعہ کلام ''انہار'' کی آخری ۲۳ غزلوں میں ردیف ''سیہ'' اور ''سیاہ'' ہے اور ایک غزل کی ''سیہ سیہ''۔ اس اعتبار سے انہوں نے مشکل قافیوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً جستجو، پہلو، زباں، دروازہ، دیدۂ حرمت، ابتری، تودۂ شاداب، شبنم، وحشت، نالے، طلب، اظہار، پیکر، نوائے وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان قافیوں کو ردیف ''سیاہ'' اور ''سیہ'' کے ساتھ نبھانا ہی بہت تخلیقی عرق ریزی چاہتا ہے۔ رفیق راز نے انہیں جس طرح تخلیقی فن پارے کا حصہ بنایا ہے، وہ ان کی قادر الکلامی پر دال ہے۔ چند اشعار اس تعلق سے ملاحظہ ہوں۔

دیوار و در پہ اب تو چمکتی ہے خامشی
اس گھر میں ہانپتی تھی کبھی گفتگو سیاہ

اک جوئے برق و موجہ بوئے رواں سیاہ
میری سیاہ فکر میں ہے لامکاں سیاہ

شہر شک شام گماں شعلہ نا امیدی
نفس مضمون بھی سیہ اور حوالے بھی سیہ
وقفے وقفے سے اذانوں کا دھواں اٹھتا ہے
سانس لیتا ہے ابھی شہر کا مینار سیہ

جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہے کہ رفیق راز نے زبان کی تراش خراش کو مواد، ہیئت اور تکنیک کے تجربوں سے منسلک کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جدت طبع سے وہ رنگ بھرے ہیں کہ فکر و خیال اور جذبہ و احساس علامتی، اساطیری اور کہیں کہیں دیو مالائی تمثیلوں کی شکل میں مشکل اور تلخ بیانات کو سنجیدہ پیرائے میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ رفیق راز نے زبان اور تخلیق کے مروجہ اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہو۔ بلکہ جہاں جہاں بھی اپنے خیالات کے اظہار کے لیے انہوں نے مروجہ الفاظ کی تنگ دامانی کو محسوس کیا، وہاں ترمیم و تنسیخ کے نسخوں سے کام ضرور لیا ہے۔ اور یقیناً یہ ان کے خیالات، محسوسات اور جذبات کی فطری آواز ہے جس نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔

دیوار و در سے ٹپکے یونہی قطرہ قطرہ زہر
سوئے ہواؤں پہ موت کا سایہ پڑا رہے

ایک پودا اگا ریگ زاروں میں جواب بھی آواز دیتی ہیں اس پیاسے کو
ڈوبے ڈوبے کناروں کی مدہوشیاں ٹھہرے سمندر کی گہرائیاں

بولے تو اک سکوت کے شعلے نے ڈس لیا
لب سی لیے تو والی شہر صدا ہوئے

عجیب لوگ تھے منزل کی بات کرتے تھے
چمکتی آنکھوں میں عکس غبار دشت لیے

یہ آسماں ہے مرے سر پہ اور زمیں نیچے
میں رینگتا ہوں ازل سے یہ تاج و تخت لیے

رفیق راز نے اپنے اشعار میں زبان کا جو انفرادی اور ایک حد تک باغیانہ استعمال کیا ہے اس سے انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی ذہن اردو ادب کی تحریکوں اور رجحانوں سے خاصی حد تک واقفیت ہی نہیں رکھتا بلکہ ان تحریکوں سے استفادہ کرتے ہوئے شاعری میں برتنے کی فنی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ ان کے اشعار جہاں داخلی اور ذاتی حقائق کا اظہار کرتے ہیں وہیں خارجی حقائق سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے۔ وہ بخوبی واقف ہیں کہ داخلی واردات کتنے بھی ذاتی کیوں نہ ہوں، ان کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں خارجی حقائق سے ضرور ہوتا ہے ورنہ وہ محض تصوراتی نہج تک تو کارآمد ہو سکتے ہیں لیکن جمالیاتی عناصر کے فقدان کے سبب ان کی سطح بہت کمزور ہوتی ہے۔ ذات اور کائنات کے موضوعات کو احاطہ تخلیق میں لانے کے لیے بحور و اوزان کے مشکل، مشکل تر اور مشکل ترین انتخابات کے سبب آہنگ کے اعتبار سے یہ انوکھی ہیئت تشکیل خلیل الرحمٰن اعظمی کے ایک نظریے کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ حالانکہ ان کا یہ بیان بالخصوص نظم کے حوالے سے ہے۔ وہ یہاں پوری نئی شاعری سے گفتگو کر رہے ہیں جس سے کافی حد تک اسے صنف غزل سے بھی منسوب کیا جا سکتا ہے اور آج کے عہد پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے لفظوں میں:

> ''یہ دور برصغیر ہند و پاک میں تہذیبی، سیاسی، اخلاقی اور سماجی اقدار کی پامالی کا دور ہے۔ نظریہ، عقیدہ، نصب العین، آدرش، خوش آئند مستقبل کا خواب، جماعتی وابستگی اور اجتماعی تحریک پر یقین کا طلسم ایک ایک کر کے بکھرنے لگا۔ مینی فیسٹو، اعلان نامے، طے شدہ راستوں پر چلنے اور چل کر اپنی منزل مراد تک پہنچنے کے دعوے بے معنی اور بے سود نظر آنے لگے۔ نیکی، بدی، جھوٹ اور سچائی، محبت اور نفرت، خلوص اور عدم خلوص کے بنے بنائے پیمانے بے کار نظر آنے لگے..... نئی شاعری اب آزاد نظم کے مترادف نہیں سمجھی جاتی۔ نہ اس کی متعین اور سکہ بند ہیئت ہے اور نہ اس کا بندھا ٹکا اسلوب، پابند، نیم پابند، معرا، آزاد ہر طرح کی اسالیب میں نئی جہتیں پیدا ہوتی ہیں اور نئی حسیت نے ان میں تازگی پیدا کی ہے..... نئی علامتیں، الفاظ کے تلازمے، نئے امیج، نیا منظر نامہ اور نئی فضا کا ہر جگہ احساس ہوتا ہے۔''

اب رفیق راز کے چند اشعار کو دیکھا جائے۔

مجھ سے ہوائے تند پریشان ہے بہت
صحرا شناس حرف جنوں کا غبار ہوں

بس اک شبیہ خواب تھی جب تک نگہ میں تھی
اتری ہماری روح میں درود الم ہوئی

نہ جانے اگلی منزل کیسی ہوگی
پریشاں حال ہے یہ راستہ بھی

صحراؤں کے سفر پہ روانہ ہوا تھا میں
بکھرا پڑا ہوں ریت میں آثار کی طرح

رفیق راز نے اپنی شاعری میں خارج سے داخل کی طرف رخ کرتے ہوئے فرد سے کائنات کے رشتے کی دریافت کے سلسلے میں شخص اور جذباتی سطحوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ شعری تخیل میں شرکت ذات کے حوالے سے انہوں نے داخلی کیفیتوں کو اپنے اردگرد کے ماحول اور لامحدود پھیلی ہوئی کائنات سے اس طرح منسلک کیا ہے کہ اسلوبیاتی اظہار اس عہد کے مروج لسانی رویے سے بہت مختلف نظر آتا ہے یا اس کے آگے کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ ایک زوال پذیر تہذیب کی نمائندگی اور اس کے سائے میں اپنی شعری ذات وصفات کو لے کر چلنے کا عمل ذہنی پیچیدگی اور تخلیقی پیچیدگی کے درمیان سے بھی کسی نہ کسی مثبت راہ کا سراغ لگالیتا ہے اور کامیابی سے اپنی منزل کی طرف رخ کرتا ہے۔

تم کہ برفیلی گپھاؤں میں کہیں بھی نہ ملے
ہم کہ مٹھی میں لیے شمس و قمر آئے تھے

روشن ہے اک لکیر سر آسماں ابھی
کتنی ہے سخت جاں یہ دعائے سحر زدہ

لمس کی ضرب ہوتی ہے کاری
ہانپتے ہیں تمام نر ناری

زنداں کے بام و در پہ ہے رونق عجیب سی
شاید اڑا ہے رنگ ضمیر اسیر کا

ڈالی گئی تھیں کلفتیں اس میں ہزار ہا
دامن ہے تار تار جلالی فقیر کا

رفیق راز نے شاعری کی اخلاقی قدروں کو زمان و مکاں کے ادراک کے ساتھ ساتھ بعض لمحاتی کیفیتوں اور شاعرانہ فکر و احساس کے مختلف پہلوؤں کے آئینے میں بھی پرکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے تشکیلی اور اثباتی پہلوؤں کا حصہ ادبی حسیت سے بہت استوار ہے۔ رفیق راز اپنے عہد کی ہر بدلتی ہوئی حقیقت کو اس طور پیکر میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں کہ موجودہ عہد ہی نہیں بلکہ آنے والے عہد میں بھی ان کی شاعری مشعل راہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

میری وحشت کہہ رہی ہے بار بار
اس جگہ پہلے کبھی صحرا نہ تھا

میرا چراغ مانگ رہا ہے دعائے صبح
ظلمت کدے میں گرتی ہوئی بجلیوں کے بیچ
ہر شخص اپنے آپ سے مصروف ہے بہت
تنہا نہیں ہے کوئی بھی تنہائیوں کے بیچ

تو نے سب کچھ خاکستر ہی کر ڈالا
یہ خصلت تو آگ میں پائی جاتی ہے

رفیق راز نے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور شعری روایت کی نئی تبدیلیوں کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس طرح اپنی شاعری کو سنوارا اور نکھارا ہے کہ ان کی شاعری موجودہ اور آنے والے عہد کے لیے نئے شعری افق کی جستجو کے زاویے فراہم کرتی ہے۔ رفیق راز نے اس جانب خود اپنے شعر میں یوں اشارہ کیا ہے۔

ہمارے خون کی خوشبو کہ جاگ اٹھے گی
معطر اس سے یہ اکیسویں صدی ہوگی

نمونۂ کلام

عشق جنوں گیر کی ظلمت بھی تھی
روشنیٔ آتش و حشت بھی تھی

شوق نظارہ سے بھی مغلوب تھا
جلوۂ صد رنگ کی دہشت بھی تھی

تیرے کرم یوں تو بہت تھے مگر
مجھ پہ کسی غم کی عنایت بھی تھی

لمس کے تپتے ہوئے صحرا میں رات
پیاس بھی تھی بارش رحمت بھی تھی

سوچ کہ تھی میرے ہی نشے میں چور
میرے نہ ہونے کی علامت بھی تھی

وسعتوں کا سلسلہ درپیش تھا
راہ میں اک منظر حیرت بھی تھی

سوچ میں ڈوبا ہوا ہوں شاید خاموشی بھی گہری ہے
ریت کے اک ذرے میں جیسے ساری دنیا سمٹی ہے
تیرا ہونا تیرے ہونے کی پہنائی پر ہے محیط
میری ادنیٰ سوچ کہ پھر بھی جال بچھائے رہتی ہے
خوف خزاں تو ہر موسم میں رہتا ہے سر سبز مگر
ایک ہری آواز پہ اکثر زردی چھائی رہتی ہے
کام نہیں آتی ہے تیری یاد کہ پسپا ہوتا ہوں
شام ڈھلے تنہائی پورے گھر پر حملہ کرتی ہے
میں تو تیری خوشبو کی آہٹ پر دھیان لگائے ہوں
کچھ نہ سمجھ پاتا ہوں، مجھ سے باد صبا کیا کہتی ہے
یوں تو میں نے خواب کئی دیکھے ہیں دکھائے کچھ اس نے
رات کے خواب نے روح میں لیکن دہشت پھیلا رکھی ہے
لگتا ہے فردوس کی مٹی سے کچھ اس کا رشتہ ہے
اس کے بدن میں خوشبو کی اک ندی سی بہتی رہتی ہے

سمندروں کے بچھڑنے کی سرگذشت لیے
وہ تہہ نشین ہوا راز بلند و پست لیے

عجیب لوگ تھے منزل کی بات کرتے تھے
چمکتی آنکھوں میں عکس غبار دشت لیے

وہ خود کو ایک سمجھ کر خدا سے لڑنے لگا
ہوا چلی بھی گئی اس کا لخت لخت لیے

ہے چپہ چپہ سکون و ثبات کی تفسیر
ہے پتہ پتہ پیام ہوائے سخت لیے

یہ آسماں ہے مرے سر پہ اور زمیں نیچے
میں رینگتا ہوں ازل سے یہ تاج و تخت لیے

ہتھیلیوں میں اگاتے ہیں وہ جہاں سورج
میں ٹوٹ پڑتا ہوں ذوق سیاہ بخت لیے

انہی حروف کو سوچو تو کوئی بات بنے
یہی حروف ہیں نقش صدائے وقت لیے

ڈوب ہی جاؤں گا یہ سوچا نہ تھا
یہ سمندر اس قدر گہرا نہ تھا

میں ہی تھا اور میرے خواب تھے
چار سو تیرا دھواں پھیلا نہ تھا

لمس کی لذت کا قائل تھا مگر
یوں دہکتی آگ سے کھیلا نہ تھا

وہ تھے ہم تھے لالۂ آواز تھا
اتنا دہشت ناک یہ صحرا نہ تھا

میری وحشت کہہ رہی ہے بار بار
اس جگہ پہلے کبھی صحرا نہ تھا

دھوپ کے ٹکڑے تھے کچھ بکھرے ہوئے
اس طرف دیوار کا سایہ نہ تھا

گم سم ہوں میں بھی مہر بلب صوفیوں کے بیچ
قہر ہوا ہوں جیسے گھنے جنگلوں کے بیچ

میرا چراغ مانگ رہا ہے دعائے صبح
ظلمت کدے پہ گرتی ہوئی بجلیوں کے بیچ

میں حیرتوں کا جلوۂ عریاں ہوں اور تو
اک معجزہ ہے ڈھیر سی حیرانیوں کے بیچ

ہر شخص اپنے آپ سے مصروف ہے بہت
تنہا نہیں ہے کوئی بھی تنہائیوں کے بیچ

اب بھی بجھا نہیں ہے تری یاد کا چراغ
جگنو سا رینگتا ہے سیہ آندھیوں کے بیچ

یوں تو ہیں سب خموش مگر تیری خامشی
اک نور کی لکیر سی خاموشیوں کے بیچ

اب بھی ہے جانے کون سے موسم کا منتظر
بے برگ و بار پیڑ کوئی پربتوں کے بیچ

ہر سمت پھیلا ہوا ہے دھواں سا
روشن ہے کچھ کرب آوارگاں سا

دیوار و در پر ہیں جلوے اسی کے
میرا مکاں بھی ہوا لامکاں سا

پاؤں کے نیچے تو دھرتی نہیں ہے
سر پر ہے موجود اک آسماں سا

چلتا رہے تو ہے اک موج طوفاں
رک جائے تو ایک سرو رواں سا

آغاز بھی وہ ہے انجام بھی وہ
یعنی مکمل ہے وہ داستاں سا

دشت و جبل بھی ہیں خورشید و مہ بھی
خوابوں کا عالم ہے تیرے جہاں سا

رہتا ہوں پہروں میں اس کی ہی دھن میں
آنکھوں سے یارب وہ کیوں ہے نہاں سا

مڑ کر نہ دیکھوں نہ رک کر ہی سوچوں
بے سدھ ہوں تیری ہی جانب رواں سا

اک فلک اور ہی سر پر تو بنا سکتے ہیں
کرۂ ارض کو بہتر تو بنا سکتے ہیں
روح میں جس نے یہ دہشت سی مچا رکھی ہے
اس کی تصویر گماں بھر تو بنا سکتے ہیں
اشک سے خاک ہوئی تر یہی بس کافی ہے
ایک بے جان سا پیکر تو بنا سکتے ہیں
ہم اگر اہل نہیں پیڑ کے پھل کھانے کے
شاخ سر سبز کو خنجر تو بنا سکتے ہیں
سچ ہے ہم گر یہ کناں کچھ بھی نہیں کر سکتے
ریگ زاروں کو سمندر تو بنا سکتے ہیں
آتش و نور سے بجلی کے رہیں کیوں محروم
ہم سر دشت نیا گھر تو بنا سکتے ہیں
گرچہ پرواز کی قوت نہیں خواہش ہے بہت
ہم خیالات کو شہپر تو بنا سکتے ہیں
لالہ گوں منظر شاداب سرابوں میں بھی
قلزم خوں ہو میسر تو بنا سکتے ہیں

گہرائیوں میں ہانپتے منظر کے رنگ دیکھ
چپ چاپ ہولناک سمندر کے رنگ دیکھ

سیل سیہ کی زد میں ہے باہر ہر ایک شے
مژگاں نہ کھول غور سے اندر کے رنگ دیکھ

آنکھوں میں آرزو بھی ہے دم بھی ہے شوق بھی
ہر سمت کائنات کے جی بھر کے رنگ دیکھ

لانے لگی ہے رنگ اڑانوں کی خواہشیں
اڑنے لگے ہیں اور بھی شہپر کے رنگ دیکھ

اب اس ہوائے زرد کا ڈر کیا رفیق راز
شبنم نے پی لیے ہیں گل تر کے رنگ دیکھ

دی یہ کس نے اذاں راستے میں
جھک گیا آسماں راستے میں
کس سفر پر روانہ ہوئے تھے
آگیا لامکاں راستے میں
پوچھیے سچ تو خورشید بھی تھا
ذرۂ ضو فشاں راستے میں
تو ہی تو ہے وہاں منزلوں پر
میں ہی میں ہوں یہاں راستے میں
روشنی کے لیے تھی مقرر
ایک برق تپاں راستے میں
بھید ظلمات کے کھولتی ہے
گرد سیارگاں راستے میں
تیری آواز آئی کہیں سے
مل گئے دو جہاں راستے میں
نصب کس نے کیا تھا اچانک
ابر کا سائباں راستے میں
پھر سے منزل کا ہوگا تعین
رک گیا کارواں راستے میں
ہے ابھی دلی دور اور کتنی
کیا بتاؤں میاں راستے میں

ہماری طرح حروف جنوں کے جال میں آ
کبھی تو جلوہ گہہ نون جیم دال میں آ

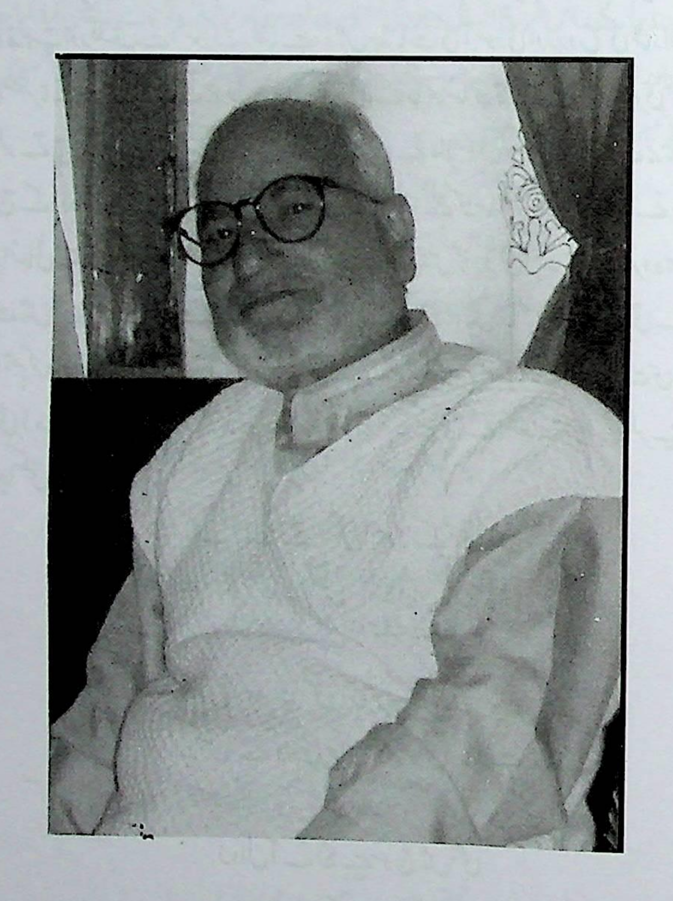
ابھی تو گرد زمانے کی اڑ رہی ہے یہاں
ابھی نہ مثل صبا کوچۂ خیال میں آ

گزر نہ جائے کہیں خامشی میں یہ شب بھی
مراقبہ تو ہوا اب ذرا جلال میں آ

تجھے بھی آج کوئی روپ بخشتا ہی چلوں
تو سنگ ہے تو مرے دست باکمال میں آ

یہاں زوال کا منظر بھی لا زوال نہیں
یقین نہیں تو بیابان ماہ و سال میں آ

ہمدم کاشمیری



انسانی قدروں کا پاسدار شاعر۔ ہمدم کاشمیری

ہمدم کاشمیری ہمارے عہد کے ایک ایسے شاعر ہیں، جن کے یہاں انسانیت کے درد کے درماں کے طور پر ایک شعری عقیدہ، ایک سمت اور میلان کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ شعری میلان جہاں مذہب اور فلسفہ سے انسلاک رکھتا ہے، وہیں جذبات کی آسودگی اور روح کی شادابی کے لیے تخلیقی منظرنامے مرتب کرتا ہے جو جذبات کی سیرابی کے ساتھ ساتھ قارئین کی عام شعری حسیت کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ اپنے اس تخلیقی عمل میں ہمدم کاشمیری نے علامتوں کو بھی کثرت سے برتا ہے۔ جیسا کہ آج کے دور میں دیکھا جارہا ہے اور پہلے بھی دیکھا گیا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے بلاشبہ مادی طور پر انسانی زندگی کو نئی نئی منزلوں سے ہم کنار کیا ہے لیکن اس کا ردعمل احساس کے مردہ ہوجانے کی صورت میں بھی سامنے آیا ہے۔ لہٰذا انسانی قدروں کے استحکام میں سائنس اور ٹکنالوجی نے اب تک کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا ہے۔ اس لیے جدید ادب کے عرفان پر ادب کے علاوہ بہت سی دیگر انسانی اور سماجی ذمہ داریاں خود بہ خود عائد ہوجاتی ہیں۔ ہمدم کاشمیری کے اشعار میں اس نظریے کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

کب آئے تھے جنگل چھوڑ کے بستی میں
ہم کو دور نقل مکانی یاد نہیں

طلوع ہو نہ سکی روشنی نگاہوں میں
یہ کس نے وادیٔ جاں کو دھواں بنایا ہے

زوال آنے لگا ہے سوچ میں بھی
سمندر ہوں کنارا سوچتا ہوں

سالہا سال رہا پاؤں میں چکر اس کے
در بدر پھرتا رہا ٹھور ٹھکانے والا

آج ہر ظلم وہ سہتا ہے برابر چپ چاپ
چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے والا

ہمدم کاشمیری کے اشعار میں زبان کے امکانات لفظ اور ذہن کے تعلق سے جو ایک وسیع کینوس نظر آتا ہے وہ علامتوں کے ذریعہ اور کبھی علامتوں کے بغیر تخیل کے تخلیقی استعمال کا مرہون منت ہے۔ آج کے اس دور میں عام انسان اور زیادہ تر خواص انسانوں کی بھی یہ فطری مجبوری رہی ہے کہ روزی کی جستجو کے توسط سے جینے کی ہم کو سر کیا جائے اور بعض اوقات یا عام سطح پر انسانی قدروں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس طرح انسانی وجود کی معنویت اور معیار پر حرف آتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ تہذیب اور اخلاق کا قیمتی سرمایہ نظر اندازی کی اس فضا کے دھندلکوں میں گم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہمدم کاشمیری کے چند اشعار۔

وہی نظر تھی، وہی انتظار تھا، میں تھا
نوحِ جاں سے گزرتا غبار تھا، میں تھا
کہاں کہاں نہ ہوئیں خوں سے تر بتر آنکھیں
جہاں بھی عرصۂ ناسازگار تھا، میں تھا
ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے گم صم
سڑک پہ مجھ سے بڑا اشتہار تھا، میں تھا

میں حقیقت کی دہلیز تک آ گیا
کر سکو گے مجھے داستاں سے الگ؟

بستی میں کوئی قتل ہوا جب
گھر میں شور مچایا ہم نے

دیکھتی ہی رہ گئیں پرچھائیاں
اور کوئی گھر میں داخل ہو گیا

ہمدم کاشمیری نے اپنے اشعار کے ذریعے انسانی قدروں کی پامالی پر جس طرح روشنی ڈالی ہے اور انہیں جس طرح جاگزیں کیا ہے، وہ زمانوں کے مصنوعی احساسات جو کہ فیشن اور فارمولا زدہ

زندگی کے زیر اثر پیدا ہوئے ہیں اور ان کے سارے امکانات پورے اخلاقی، سماجی، سیاسی اور معاشرتی منظر اور ان کے پورے وجود کے متعلق غلط فہمی پیدا کرتے ہیں، کی اپنے شعری اسلوب میں شدت سے مذمت کرتے ہیں۔ اس طرح کے شعری رویے دوسرے بہت سے شاعروں کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی دور میں زندگی بسر کرنے والے شعرا کے یہاں بعض ادبی آوازیں مشترک ہوتی ہیں۔ اور اسے خصوصیت سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے، عیب سے نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی شاعر کی ایک انفرادی خصوصیت یہ بھی ہونی چاہیے کہ اس اشتراکیت میں بھی انفرادیت کے کسی نہ کسی پہلو کو برقرار رکھے جو اس کے مختلف فنی اظہار کی ضمانت بن سکے۔ ہمدم کاشمیری کے یہاں یہ فنی اظہار بہت عمدہ طریقے پر موجود ہے۔

جو بھی صورت ہو، بجا ہے لین دین
اب نہیں ہوتا ہے شرمندہ کوئی

خزاں کے بعد یہاں موسم بہار نہ تھا
ہماری برف میں شاید کوئی شرار نہ تھا

بہت طویل تھا، آنکھوں سے دور تھا وہ جب
قریب آ کے بہت مختصر دکھائی دیا

ساری دنیا میں گھوم آیا ہوں
دائروں میں ہے دائرہ موجود

ہم کہیں پھینک کے آئے ہیں کرائے کے چراغ
اپنی ہی آگ میں روشن ہیں یہاں گھر اپنے
اب یہاں کس سے کرے کوئی شکایت ہمدم
شہر اپنا ہے، جنوں اپنا ہے، پتھر اپنے

ہمدم کاشمیری کے بعض اشعار میں جو ایک المیاتی لہر محسوس ہوتی ہے، وہ مستحکم روایتی قدروں اور وقتی اور ہنگامی قدروں کے باہم متصادم ہونے سے وجود میں آئی ہے۔ اس کا اظہار بعض

مقامات پر انہوں نے نہایت سنجیدگی اور بعض مقامات پر سنجیدگی کے پردے میں طنزیہ یا ہجویہ اسلوب میں کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار کے ذریعے دائم نظر آنے والی عارضی شہرتوں کی سطحیت کو واضح کرنے کے لیے بعض جگہوں پر تو کسی آئیڈیل ارادے جسے انسانی شعور کے ارتقا کی اہم کڑی بھی کہا جا سکتا ہے، کو مذہب اور فلسفے سے منسلک کر کے شعری جامہ پہنایا ہے اور کہیں سادہ الفاظ کی در و بست کے سہارے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ انہیں پورا احساس ہے کہ روایت اور قدیم فنی سرمائے کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اور انہیں ان کا جائزہ مقام و مرتبہ دیتے ہوئے جدید تخلیقی تجربوں کو کس طرح شعری اظہار میں لایا جاسکتا ہے۔

حقیقتوں کا کبھی سامنا ہوا ہی نہیں
کہیں پہ خواب، کہیں پہ سراب دیکھے ہیں

کوئی ہے جو فقط اتنا بتائے
کہ دنیا میں کہاں کتنا دھواں ہے
کس نے آج تک پوچھا نہیں ہے
یہ کس کی آگ ہے، کس کا دھواں ہے

ہمارے شہر میں یہ بات ہوگئی ثابت
کسی بھی جرم کی ہوتی نہیں سزا سائیں

نظر پڑی بھی ہماری کہیں تو پتھر پر
کسی کے ہاتھ میں جو پھول تھا، نہیں دیکھا

ہمدم کاشمیری کی تخلیقی بصیرت جہاں ذات کے داخل میں جمی کدورتوں کی نشاندہی کو اپنا تخلیقی فرض گردانتی ہے، وہیں اپنے مخصوص تخلیقی نظریے سے سماج کو بھی فائدہ پہنچانا اس کا مقصد ہے۔ یہ تخلیقی بصیرت جہاں سماج میں خود کے کردار اور اس کی اہمیت کو سمجھنے کی دعوت دیتی ہے وہیں بے چین روح کی تسکین کے ادبی سامان بھی مہیا کراتی ہے۔ ان میں وہ شبہات بھی شامل ہیں جو اس دنیا میں اپنے ہونے کی اہمیت اور ادب اور سماج کے رشتوں پر بھی سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ یہ سوالیہ نشان جب پیچیدہ الجھنوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو ان کا بیان شعری سیاق میں مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اگر

شاعر ماہرفن کار نہ ہوتو یہ پیچیدہ بیانی الجھی ہوئی اور اکھڑی اکھڑی زبان کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تخیلات کے پیچیدہ مراحل ایسے ابہام کی شکل لے لیتے ہیں جو معنی کے تضاد اور بعض اوقات اس کے سطحی پن کو بھی اپنی گرفت میں لے کر شاعر کی صلاحیت کے منفی پہلوؤں کو اجاگر کر دیتے ہیں۔ ایسا شاعر ذہن کی تخلیقی رو کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر پاتا بلکہ سطحی خطابت اور بے جان تخلیقی اجتہاد سے ناکامیات کوششیں کرتا رہتا ہے۔ ہمدم کاشمیری کے لیے یہ بات نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے اپنے تخلیقی تقاضوں کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ جیسا کہ ان کے اشعار سے واضح ہے۔

رقم جو روح پہ ہے اس نشاں کو دیکھتا ہوں
نکل کے گھر سے میں اپنے مکاں کو دیکھتا ہوں
کہیں سے آتی ہے کیوں آج اجنبی خوشبو
پھر ایک بار صف دشمناں کو دیکھتا ہوں

جیسے میں کوئی کھوٹا سکہ ہوں
دیکھتے ہیں وہ بار بار مجھے

ہے عجب کشمکش جاں در پیش
جرم سوچا ہے، سزا سوچتا ہوں

میں خلاؤں میں بھٹکتا ہوں مگر
عرش تا فرش نظر ہے مولا
ایک مدت سے یہی سنتے ہیں
رات کے بعد سحر ہے مولا

ہمدم کاشمیری کی شاعری جہاں جدید دور کی مختلف حقیقتوں کا آئینہ ہے وہیں روایت اور انسانی قدروں کی پاسدار بھی۔ جدید دور میں ایسے شعرا کی تعداد بہت کم ہے جو ہمدم کاشمیری کی طرح دو زمانوں کے اقدار اور نظریات کے ساتھ انصاف کر پاتے ہیں۔

نمونۂ کلام

پچھلے سفر کی کوئی نشانی یاد نہیں
تھا اپنا بھی کوئی ثانی یاد نہیں

کب اترا تھا چاند ہمارے آنگن میں
کب مہکی تھی رات کی رانی یاد نہیں

جل بجھنے کا موسم کب کا بیت چکا
کتنی آگ تھی کتنا پانی یاد نہیں

اتنا یاد ہے شہر میں کوئی رہتا تھا
پورا قصہ ہم کو زبانی یاد نہیں

کب آئے تھے جنگل چھوڑ کے بستی میں
ہم کو دور نقل مکانی یاد نہیں

اب تو برف ہی برف ہے آنکھوں کے آگے
رنگوں میں کوئی رنگ تھا دھانی یاد نہیں

بس اپنی روداد سناتے رہتے ہیں
اور تو کوئی رام کہانی یاد نہیں

جہاں زمین ملی آسماں بنایا ہے
پھر اس کے بعد کوئی آستاں بنایا ہے
طلوع ہو نہ سکی روشنی نگاہوں میں
یہ کس نے وادیٔ جاں کو دھواں بنایا ہے
ابھرتے ڈوبتے رہتے ہیں ہم کہ پرکھوں نے
بنائے آب پہ شاید مکاں بنایا ہے
کہیں پہ جھوٹ کو رکھا ہے سچ کے سائے میں
کہیں یقین کو وجہٗ گماں بنایا ہے
اڑ لے نہ ریت کی صورت یہ راستہ ہم نے
قدم قدم پہ اسے کہکشاں بنایا ہے
دیا تھا رتبہ اسے میر اور غالب نے
غزل کو ہم نے مگر چیستاں بنایا ہے
مجھے نہ دیکھ یمین و یسار میں ہمدم
مجھے خدا نے میرے درمیاں بنایا ہے

طاق در طاق چراغوں کو جلانے والا
کیا ہوا سوچئے راتوں کو سجانے والا
سالہا سال رہا پاؤں میں چکر اس کے
در بدر پھرتا رہا ٹھور ٹھکانے والا
آج ہر ظلم وہ سہتا ہے برابر چپ چاپ
چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے والا
کر رہا ہے نئی تعمیر کی باتیں کیسے!؟
جا بہ جا شہر کے آثار مٹانے والا
زندگی اپنی تو بے کار گئی ہے ہمدم
اوڑھنے والا ملا ہے نہ بچھانے والا

وہی نظر تھی وہی انتظار تھا، میں تھا
نواح جاں سے گزرتا غبار تھا، میں تھا
شراب و شعر کا تھا ذائقہ لبوں پہ مگر
بیاضِ جسم پہ لکھا فشار تھا، میں تھا
کہاں کہاں نہ ہوئیں خوں سے تربتر آنکھیں
جہاں بھی عرصۂ ناسازگار تھا، میں تھا
ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے گم صم
سڑک پہ مجھ سے بڑا اشتہار تھا، میں تھا

کہیں منزل کہیں پر راستہ گم
ہمارے شہر میں کیا کیا ہوا گم

دعاؤں میں اثر باقی نہیں ہے
ہوئے محراب میں نقش صدا گم

اگی ہیں گھاس میں چنگاریاں سی
ہوئی ہے برف کی اجلی قبا گم

کسی کا عکس کب سے ڈھونڈتے ہیں
ہوا ہے آئینوں میں آئینہ گم

ہماری آنکھ میں اب کیا بچا ہے
کہیں پانی کہیں عکس ضیا گم

سراغ اپنا کہیں ملتا نہیں ہے
ہوئے ہیں ہر قدم پر نقش پا گم

سروں پر آسماں اٹکا ہوا سا
زمیں بھی ہو گئی ہے زیر پا گم

جسے ہم دیکھتے تھے گاہے ماہے
ہوا ہے اب کہاں وہ کم نما گم

کام تھا آسان مشکل ہو گیا
رنگ کیسا خوں میں شامل ہو گیا
کیسے میرے اور میرے درمیاں
اک عجب پردہ سا حائل ہوگیا
دیکھتی ہی رہ گئیں پرچھائیاں
اور کوئی گھر میں داخل ہو گیا
اب کہاں جائیں گے بستی چھوڑ کر
جو بھی دعویٰ تھا وہ باطل ہو گیا
شعر میں ہوتا تھا جادو کا اثر
رفتہ رفتہ وہ بھی زائل ہو گیا

خزاں کے بعد یہاں موسم بہار نہ تھا
ہماری برف میں شاید کوئی شرار نہ تھا

کوئی گھٹن تھی عجب سی قدم قدم پہ یہاں
کوئی بھی راستہ ایسا تو تنگ و تار نہ تھا

ہمیں خبر تھی کوئی بھی نہ تھا یہاں محفوظ
کرامتوں کا کسی کو بھی انتظار نہ تھا

بہت دنوں سے کسی نے کیا نہ یاد ہمیں
ہمارے شہر کا موسم بھی خوشگوار نہ تھا

لہولہان ہوئے سب پڑے پڑے گھر میں
عجب تھا یہ کہیں میدان کار زار نہ تھا

ہر ایک بزم میں میرا ہی ذکر تھا ہمدم
یہ اور بات کہیں بھی میرا شمار نہ تھا

اندھیری رات میں عکسِ قمر دکھائی دیا
یہ میرے عیب میں کیسا ہنر دکھائی دیا
بھٹکتے پھرتے رہے بے حواس گلیوں میں
ہوئی جو شام تو اپنا ہی گھر دکھائی دیا
یہ کیسے رک گئے یکبارگی قدم اپنے
نشاں یہ کیسا میانِ سفر دکھائی دیا
بہت طویل تھا آنکھوں سے دور تھا وہ جب
قریب آ کے بہت مختصر دکھائی دیا
یہ کس کا حق نمک ہو گیا ادا مجھ سے
میرے بیاں میں یہ کس کا اثر دکھائی دیا
زمیں اپنی سلامت نہ آسماں، قاتل
کوئی گلی میں کوئی بام پر دکھائی دیا
ہر ایک بزم میں لگتا ہے نغمہ خواں ہمدم
ہر ایک شعر میں وہ تازہ تر دکھائی دیا

آنکھ اپنی ہے ہر اک سمت ہیں منظر اپنے
آسماں اپنا ہے اڑتے ہیں کبوتر اپنے

ہم کہیں پھینک کے آئے ہیں کرائے کے چراغ
اپنی ہی آگ میں روشن ہیں یہاں گھر اپنے

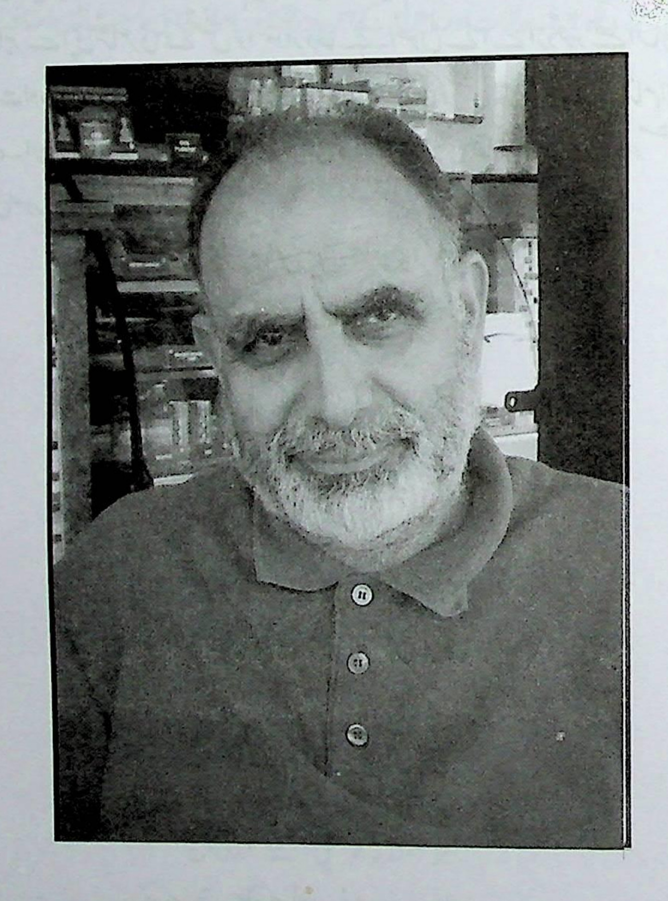
اس نے چہرے کی عبارت پہ قناعت کی ہے
کچھ بھی باہر سے نظر آیا نہ اندر اپنے

ہر طرف زور ہے پانی کا یہاں لگتا ہے
ڈوبنے کے لیے آئے ہیں شناور اپنے

اب یہاں کس سے کرے کوئی شکایت ہمدم
شہر اپنا ہے، جنوں اپنا ہے، پتھر اپنے

سجی سجائی سی کیسی دکاں کو دیکھتا ہوں
کہیں پہ زخم کہیں پر نشاں کو دیکھتا ہوں
رقم جو روح پہ ہے اس نشاں کو دیکھتا ہوں
نکل کے گھر سے میں اپنے مکاں کو دیکھتا ہوں
کہیں سے آتی ہے کیوں آج اجنبی خوشبو
پھر ایک بار صف دشمناں کو دیکھتا ہوں
ہر ایک سمت یہاں صرف پیاس بہتی ہے
کبھی جو غور سے آب رواں کو دیکھتا ہوں
کسی کے کفر میں ایمان کی حرارت ہے
یقین سے بڑھ کے میں اپنے گماں کو دیکھتا ہوں
خدا بچائے نشانی ہے یہ قیامت کی
رکی زمین پہ سرو رواں کو دیکھتا ہوں
وہ جس میں ذکر ہوا ہے ہمارے ہونے کا
کسی کے لب پہ اسی داستاں کو دیکھتا ہوں
سرک رہی ہے زمیں صاف آرہا ہے نظر
سروں پہ گرتے ہوئے آسماں کو دیکھتا ہوں

ایاز رسول نازکی



ایاز رسول نازکی کی شعری کائنات

ایاز رسول نازکی نے اپنے اشعار میں حقیقت نگاری کے جن جن رویوں کو برتا ہے، ان میں سماجی، سیاسی اور اقتصادی بہت اہم ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے انسانی شعور، عمل اور جذبے کے تمام مظاہر سے اپنی شاعری کے تعلق کو استوار رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے اردگرد پھیلے انسانی وجود کی خواہشات اور محسوسات کو شعری کلیت کے ساتھ فعال بنانے کی کوشش میں شخصیت کے تمام ابعاد پر نظر رکھی ہے۔ ان کی نظر میں ماضی، حال اور مستقبل کا انسان تاریخی حقائق، عہد حاضر اور مستقبل کے امکان کی صورت میں جلوہ گر رہتا ہے۔

ہم نہ مومن ہیں، ہم نہ کافر ہیں
کلمہ گو ہیں عبادتوں کے بغیر

ڈل کے پانی میں عکس کس کا ہے
آئینے پر وہ آئینہ ہوگا

ڈیڑھ کمرے میں زندگی گزری
ایک مدت سے گھر نہیں دیکھا

خاک ہوتا وہ سربلندی میں
پائمالی میں سروری کرتا

ہم کو بچھڑے کتنے گزرے سال بتا دوں اے کشمیر
تیرے سولہ، میرے سولہ ہوتے ہیں بتیس برس

ایاز رسول نازکی زندگی کے مختلف گوشوں پر غور کرتے ہوئے اپنے سماجی پس منظر اور اپنے

معاشرتی دائروں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے آگے کی ذہنی کشمکش اور ٹکراؤ پر بھی نظر رکھتے ہیں، جس کی پیچیدگی اور تصادم کی زد میں آج کی نسل انسانی ہے۔ وادیٔ کشمیر کے مناظر قدرت کو علامتوں میں ڈھال کر معاشرتی مسائل کا شدت سے اظہار ان کی اپنی زمین کے دکھ درد کا آئینہ دار ہے۔ اس کے آگے غور کریں اور وادی کے کچھ ناموں کو علیحدہ کر دیں تو دنوں دن اپنا دامن دراز کرتی ہوئی مفلسی، ناکامی و محرومی، غلامی اور شکست کا تصور بہت عام ہے۔ جس سے مایوسی و شکست خوردگی تنہائی کا احساس، بغاوت، طنز، تشکیک، درد و کرب ایک طرح سے تقدیر کے ایک اہم عنصر کی صورت میں نمایاں ہونے لگے ہیں۔ حالات اور ماحول کے اس پر پیچ بھنور کا دائرہ اپنی وسعت میں اضافہ کرتا ہی جا رہا ہے۔

کس کو منزل کی چاہ تھی لوگو
میں ازل سے سفر پسند ہوا

•

کون تخمینے، کون منصوبے
ہر عمل واردات ہے پیارے
کتنے عالم ہیں دور نظروں سے
کچھ بھی از ممکنات ہے پیارے

ہم گرے ہیں اگر بلندی سے
در حقیقت زوال کس کا تھا

ایک کانٹا نہیں ملا ان کو
ہم تو جنگل نکال سکتے تھے
جو سمندر کو پی گئے درویش
منہ سے بادل نکال سکتے تھے

شمیم حنفی نے اپنی کتاب ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

''اسپنگلر نے ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے جو اپنے مادی وسائل اور اختیارات کی مدد سے کسی ملک یا قوم یا معاشرے کی سربراہی کے تمام

حقوق پر قابض ہو جاتے ہیں اور انسانی خیال وعمل کے ہر شعبے میں صرف ان کی تقلید ذریعہ نجات سمجھ لی جاتی ہے۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ تاریخ میں جن افراد کو لوگ بالعموم ہیرو کا لقب عطا کرتے ہیں (جذباتی اور رومانی طور پر) وہ انسانی ارتقا کی روایت میں بدترین جرائم کے مرتکب ہوتے تھے۔ مادی تاریخ کی لہر سے تہذیب کی لہر بعض اوقات الگ بھی ہو جاتی ہے۔''

(جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از شمیم حنفی، ص ۲۵،۲۶)

ایاز رسول نازکی مادی ترقی کے معیار کو ناگزیر طور پر تہذیبی ارتقا کے معیار سے ہم آہنگ تصور نہیں کرتے اور جہاں مادی ترقی کا زوال بھی تہذیبی ارتقا کے زوال کی راہیں ہموار کرتا ہو، وہاں ایک حساس تخلیق کار کے قلم سے اس نوعیت کے اشعار کا نکلنا لازمی ہے۔

وہ اپنے آپ کو ایسے ہی دیکھتا جائے
ہمیں تو عکس ہی کافی ہے عاشقی کے لیے

تیرے جانے سے لوٹ آنے تک
اک زمانہ سا درمیاں گزرا
میں بھی مارا گیا ہوں، سنتا ہوں
جانے یہ حادثہ کہاں گزرا
پھر بھی پہنچے نہیں جزیروں تک
وہ سمندر بھی بے کراں گزرا

رگوں میں دوڑتا تو سرخ ہوتا
لہو آنکھوں میں پانی ہو گیا ہے

ایاز رسول نازکی نے سماجی اور ماحولیاتی کشمکش کے درمیان زندگی کے آہستہ لیکن اس تغیر کو شدت سے محسوس کیا ہے جو آگے چل کر انقلابی تغیرات کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔ یہ انقلابی تغیرات مادی، سماجی اور سیاسی تینوں سطحوں پر رونما ہو سکتے ہیں۔ ایاز رسول نازکی کی شاعری میں عصری شعور اور فکری میلان کا خاصہ دخل ہے۔ ان کے فکری میلانات میں فنی دست گاہ کا چشمہ نسل، زبان اور تہذیب کے اختلاف سے بھی پھوٹتا ہے۔ جو بعض جگہوں پر حیات و کائنات کے مخصوص مسائل سے بھی ہم

آہنگ ہو جاتا ہے:

فنا ہوتے ہوئے سوچا جسے میں
وہی تو جاودانی ہو گیا ہے
جو دیکھی وسعت دامان قطرہ
سمندر پانی پانی ہو گیا ہے

قبیلے کے سارے جواں قید میں ہیں
میں ان کے عوض ان کا سردار مانگوں

ایک چھوٹا سا کام کرنا تھا
دل کے وحشی کو رام کرنا تھا

پوچھتا تھا پتہ ترے گھر کا
اس کو ہونا تھا در بدر شاید

ایاز رسول نازکی کے اشعار میں تاریخیت کا وہ تصور بھی ملتا ہے جس میں تاریخ قوموں کے عروج وزوال کا خاکہ مرتب کرنے میں خارجی سطح پر رونما ہونے والی کامرانیوں یا ناکامیوں کو ہی پیش نظر رکھتی ہے اور سیاسی زوال اقدار وافکار کے زوال سے مشابہ ہوتا ہے۔

ایاز رسول نازکی سماج کی بعض تفریقات کو تسلیم کرتے ہوئے بعض بنیادی باتوں پر اتحاد کی راہیں بھی تلاش کرتے ہیں جو مرے خیال میں اعلیٰ شعری مزاج کا ایک خاص وصف ہوتا ہے۔ علامت نگاری اور مشرقی فلسفے سے واقفیت نے ان کے شعری کرداروں کو جو میں، وہ، ترے اور مناظر قدرت وغیرہ کے ناموں کی صورت میں ہیں، رومانیت، زمانہ، موت اور زندگی کے موضوعات سے ملا کر شعر کے منصب کو عروج تک لے جانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

کربلا میں ہی سفر ہوگا تمام
روک دینا اب سفر ممکن نہیں

نمونۂ کلام

عشق میں ہم نے سر نہیں دیکھا
ان پہ پھر بھی اثر نہیں دیکھا
دھن سمائی تھی ایک منزل کی
راستہ پر خطر نہیں دیکھا
تم سے بڑھ کر حسین چہرے تھے
ہم نے لیکن ادھر نہیں دیکھا
ڈیڑھ کمرے میں زندگی گزری
ایک مدت سے گھر نہیں دیکھا
ایک گنبد نما عمارت دل
آنے جانے کا در نہیں دیکھا
پیڑ جس نے لگا دیا ہوگا
اس نے اس کا ثمر نہیں دیکھا
سارا جنگل ہی جل گیا آخر
آگ نے تو شجر نہیں دیکھا
ہم بھی جموں کے ہوگئے آخر
ہم نے ایسا نگر نہیں دیکھا
کوئی کہتا تھا مو سے نازک ہے
کوئی کہتا کمر نہیں دیکھا
شعر گوئی ایاز کی توبہ
اس میں کوئی ہنر نہیں دیکھا

خیر کے بدلے شر پسند ہوا
غیر تم کو اگر پسند ہوا

منتخب تھا جو کجکلاہوں میں
کوہکن کو وہ سر پسند ہوا

کوئی دیوار تھی نہ صحرا میں
قیس صاحب کو گھر پسند ہوا

زندہ رہنے کا فن نہیں سیکھا
شاعری میں ہنر پسند ہوا

کس کو منزل کی چاہ تھی لوگو
میں ازل سے سفر پسند ہوا

خیر کی جو دہائی دیتا تھا
شخص وہ کیسے شر پسند ہوا

بجلیاں جس کی تاک میں دیکھوں
مجھ کو ایسا شجر پسند ہوا

کوئی آنگن بٹا نہ ہو جس میں
ایک ایسا نگر پسند ہوا

شعر تو شش جہات ہے پیارے
اس میں کل کائنات ہے پیارے
کون تخمینے، کون منصوبے
ہر عمل واردات ہے پیارے
صبح جانا ہے، صبح تو ہولے
یہ ابھی تک تو رات ہے پیارے
ہائے نازک مزاج دل کب سے
خوگر حادثات ہے پیارے
زندگی کو دوام ایسے ہے
زندگی بے ثبات ہے پیارے
پھول کھلتے ہیں میرے آنگن میں
آج کوئی تو بات ہے پیارے
ساتھ میرے تو چل پڑا لیکن
ہاتھ میں کس کا ہاتھ ہے پیارے
تپتے صحرا میں پیڑ کی چھاؤں
اک دعا میرے ساتھ ہے پیارے
ایک خندق سے بچ گئے لیکن
اور آگے بھی گھات ہے پیارے
دوست دشمن کوئی نہیں ہوتا
سب کی اپنی ہی ذات ہے پیارے

ہجر تھا یا وصال کس کا تھا
خواب تھا یا خیال کس کا تھا

سامنے وہ ہمارے بیٹھے تھے
دل میں ان کے خیال کس کا تھا

غیر سے ہم نے مات کھائی تو
اس میں کہیے کمال کس کا تھا

ہم گرے ہیں اگر بلندی سے
در حقیقت زوال کس کا تھا

بچ کے نکلے جو لاتعلق تھے
بچ نکلنا محال کس کا تھا

ریگ ساحل پہ نقش باقی ہے
جسم وہ بے مثال کس کا تھا

شعر سنتے ہیں میرا کہتے ہیں
ایسا نازک خیال کس کا تھا

بام پر چاند تھا مگر پھر بھی
چاندنی میں جمال کس کا تھا

تم پہ ایسا کبھی سماں گزرا
سانس لینا بھی جب گراں گزرا

تیرے جانے سے لوٹ آنے تک
اک زمانہ سا درمیاں گزرا

راستے میں پڑا ہوں مدت سے
وہ گزرتا مگر کہاں گزرا

سب کی نظریں تھیں اس کے آنے پر
اس گلی سے وہ بے نشاں گزرا

میں بھی مارا گیا ہوں سنتا ہوں
جانے یہ حادثہ کہاں گزرا

پھر بھی پہنچے نہیں جزیروں تک
وہ سمندر بھی بے کراں گزرا

تم نے دوری میں کچھ کہیں پایا
وقت میرا تو رائیگاں گزرا

لڑکیوں کی ہیں انگلیاں زخمی
اس جگہ سے وہ نوجواں گزرا

لباس اس کا جو دھانی ہوگیا ہے
دوپٹہ آسمانی ہوگیا ہے
رگوں میں دوڑتا تو سرخ ہوتا
لہو آنکھوں میں پانی ہوگیا ہے
فنا ہوتے ہوئے سوچا جسے میں
وہی تو جاودانی ہوگیا ہے
لگی ہے آگ دل میں یا شجر میں
یہ نغمہ لن ترانی ہوگیا ہے
وہ جب سے لامکانی ہو گیا ہے
زمیں پر آسمانی ہوگیا ہے
کہاں جاتا وہ جنت سے نکل کر
وہیں جنت مکانی ہوگیا ہے
بھری محفل میں چھیڑا پھر کسی نے
وہ پھر سے پانی پانی ہوگیا ہے
جو دیکھی وسعت دامان قطرہ
سمندر پانی پانی ہوگیا ہے

میں شب سے سحر کے جو آثار مانگوں
میں فاروق مضطر کے اشعار مانگوں

میں ظاہر کے سارے جزیرے ڈبو دوں
میں باطن کی موجوں کے اسرار مانگوں

وہی شخص سارے شہر میں ہے یکتا
اسی شخص کا میں بھی پندار مانگوں

قبیلے کے سارے جواں قید میں ہیں
میں ان کے عوض ان کا سردار مانگوں

ابھی دشت امکاں سے باہر نہیں ہوں
عروس تمنا سے اقرار مانگوں

مرا فقر مجھ سے نہیں چھین لینا
کبھی مال و زر کے جو انبار مانگوں

اگر دے سکے تو فقط ایک چھت دے
نہ دروازہ مانگوں، نہ دیوار مانگوں

مرا چہرہ اموات میں ڈھونڈھتا ہے
میں جب بھی کبھی تازہ اخبار مانگوں

میرا قصہ تمام کرنا تھا
مجھ کو الفت کے نام کرنا تھا
ایک چھوٹا سا کام کرنا تھا
دل کے وحشی کو رام کرنا تھا
ایک خوشبو ہوا کے جھونکے پر
عشق دنیا میں عام کرنا تھا
شاخ در شاخ بولتا پنچھی
اس کو بھی زیر دام کرنا تھا
اس نے دیکھا مجھے نہیں دیکھا
چین میرا حرام کرنا تھا
شعر کہنے میں کیا ملا ہم کو
ڈھنگ کا کوئی کام کرنا تھا

ہے مرے شعر کا اثر شاید
دیکھ باہر ہوئی سحر شاید

پھر ہے آمادہ سفر شاید
اس نے باندھی ہے پھر کمر شاید

ایک در تھا کھلا، چلا آیا
آگیا ہوں میں اپنے گھر شاید

آج کل پیار سے نہیں ملتا
کرنے والا ہے وہ سفر شاید

پوچھتا تھا پتہ ترے گھر کا
اس کو ہونا ہے در بدر شاید

ساری دنیا کی مجھ پہ نظریں ہیں
تونے دیکھا تھا اک نظر شاید

اب تو موسم گزر گیا ہوگا
اس کا اترا نہیں ثمر شاید

یہ بھی الزام ہے مرے سر پر
میں نے کاٹا ہے میرا سر شاید

جس کی خاطر غزل میں کہتا ہوں
اس کو بھائے مرا ہنر شاید

رات بھر آندھیوں نے گھیرا تھا
گر گیا آخری شجر شاید

ان کے جذبے سیاستوں کی طرح
پیار کرنے عداوتوں کی طرح

وحی اترے قلم پہ نازل ہوں
شعر کاغذ پہ آیتوں کی طرح

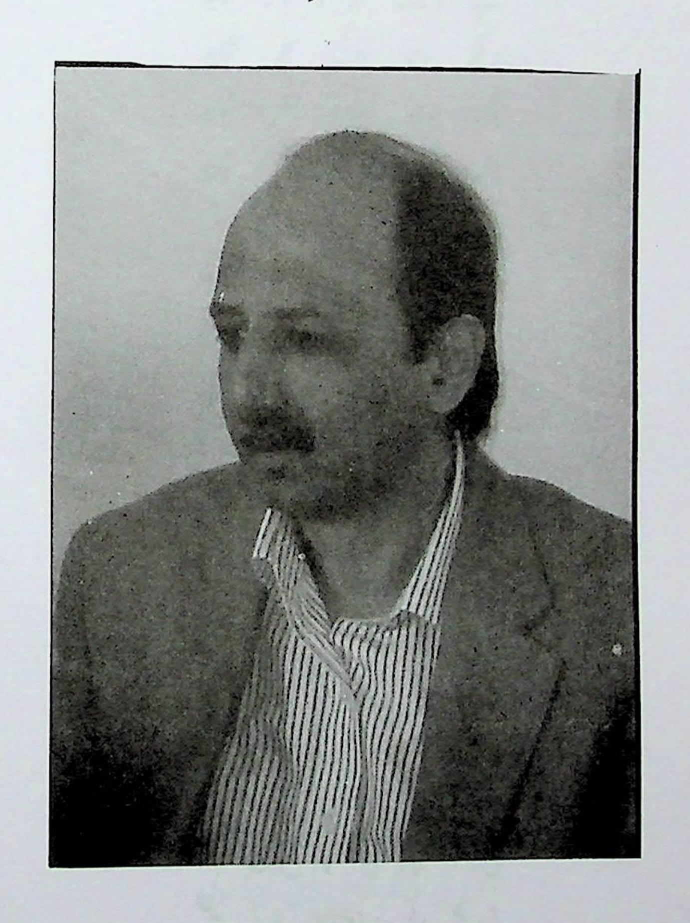
نام لینا تو باوضو لینا
عشق کرنا عبادتوں کی طرح

اب تو صدیاں گزرتی جاتی ہیں
غیر محسوس ساعتوں کی طرح

ہم جفاؤں کو بھی وفا سمجھیں
ظلم کرنا عنایتوں کی طرح

نام رکھنا خلوص ہی لیکن
کام لینا عداوتوں کی طرح

خالد بشیر احمد



خالد بشیر احمد کا طرزِ سخن

خالد بشیر احمد نے اپنے اشعار میں زندگی کی جن حقیقتوں کا اظہار کیا ہے ان میں بیش تر کا تعلق انسانی فطرت میں قدرت کی جانب سے ودیعت کردہ ان صفات سے ہے جو کافی حد تک حلم و کرم اور اس کے نتیجہ میں اظہار تشکر سے نمایاں ہوتی ہیں۔اس کا ثبوت ان کے یہاں حمد اور نعت کے اشعار میں تو مل ہی جاتا ہے۔جیسے ؎

وہ پیاس دیتا ہے تو اس کے بعد پانی بھی
اسی یقین پر ہے میری خوش گمانی بھی
اسی نے بیج کو دی ہے حیات، بادل میں
چھپائی برق بھی، سایہ بھی اور پانی بھی

مدینے کی طرف جو سارے رستے جا رہے تھے
نظر میں اس شہر کے خواب بستے جا رہے تھے
تڑپ ایسی کہ سرپٹ دوڑتی جاتی تھی خواہش
حجاب ایسا، زمیں میں پاؤں گڑتے جا رہے تھے

ان کے علاوہ بھی بہت سے اشعار جو علوم لسانیہ کے لوازمات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے اور اخلاقی، تہذیبی، معاشرتی اور ذہنی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے صحت مند سیاسی نظام جو عوام کو پرسکوں زندگی گزارنے اور زندگی کی دوسری ضروری سہولتیں فراہم کرنے میں معاون و مددگار ہو، جیسے موضوعات کو احاطۂ قرطاس میں لاتے ہیں، میں بھی اظہار تشکر اور جذبۂ خلوص کے عناصر نمایاں ہیں۔ان موضوعات کے دوسرے رخوں یعنی متضاد پہلوؤں پر غور کیا جائے یعنی جہاں حقیقت کے ان موضوعات کو تلخ اور بالکل برعکس احساسات کا جامہ پہنا دیا ہے وہاں بھی خالد بشیر احمد نے عاجزانہ اور انکسارانہ طرز کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور اپنی ان صفات کو کام میں لاتے ہوئے بہت موثر انداز میں ان کو بھی پیش کیا ہے۔

دیارِ خواب کے ہم شب گزیدہ لوگوں کے
دلوں میں خوف بہت ابتدائے شب سے ہے

دیکھا جو کچھ اس سے زیادہ اور بھی ہے
آنکھوں سے منظر کا وعدہ اور بھی ہے

ترا خیال بڑا خوش نما پرندہ ہے
مگر اُٹھان میں ہی انتقال اس نے کیا

لہو لہو تھے مناظر گھروں سے آگے بھی
لٹا چکے تھے بہت کچھ سروں سے آگے بھی

وہ خواب رکھتا ہے، آنکھیں نکال دیتا ہے
اور اس ستم پہ بھی چپ کا سوال دیتا ہے

خالد بشیر احمد نے اپنے اشعار میں مختلف ادبی تحریکات کے رویوں اور زاویوں کو استعارے کی صورت میں تو قبول کیا ہے لیکن انھوں نے اس ضمن میں ''ادب برائے فن'' یعنی Art for Artsake کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ بلکہ ادب برائے زندگی کا نظریہ ان کے یہاں زیادہ معتبر ہے۔ اصل میں وہ ادب برائے فن کو اس تصور تک محدود دیکھتے ہیں جہاں فنی تخلیق فی نفسہ اہم ہونے کے باوجود اپنی ذات کی محدودیت کو دوسرے ادبی تقاضوں اور سروکاروں پر ترجیح دیتی ہے۔ وہ نصیحت آمیز، معلمانہ اور افادی نظریہ ادب کو بھی وہی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیقی اور فنی موضوعات و نظریات میں کوئی کم یا زیادہ اہمیت کا حامل نہیں بلکہ موقع و محل کے اعتبار سے جو موضوع، نظریہ اور تخلیقی عناصر شعر کی تخلیق کے وقت اپنے بیش تر ادبی تقاضوں اور اصولوں کے تحت ان کے تصورات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ''ادب برائے فن'' کے تعلق سے پلیخنوف (Plekhanou) نے ''آرٹ اینڈ سوشل لائف'' Art and Social Life میں لکھا ہے۔

''فن برائے فن (ادب برائے فن) کا عقیدہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ فنکار اور عوام جن کو اس میں بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے، اپنے سماجی

ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔''

(Art and Social Life, Plekhanou, Page 154)

اس نکتہ نظر سے خالد بشیر احمد کے چند اشعار دیکھے جائیں۔

ہوا پہ لکھا ہوا ہے دائم نوازشیں ہیں
سمندروں کے سفر میں سبزے کی خواہشیں ہیں

تھکن سفر کی ابھی سرحد بدن میں ہے
کئی دنوں سے کوئی اجنبی وطن میں ہے

مرے وطن میں سیاہ جنوں کے ہاتھوں نے
گلی گلی میں فروزاں کیے ہیں ہو کے چراغ

ہجرت کا اک چکر اپنے پاؤں میں ہے
جانے کس صحرا میں آکر تھک جائیں گے

فصیل شہر پر لہرا رہا تھا امن کا پرچم
درون شہر لیکن راستوں سے خون جاری تھا

خالد بشیر احمد نے اپنے اشعار میں جن حالات اور زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کی ہے، اس میں غم، اداسی کرب اور مایوسی کے ساتھ ساتھ امید اور آرزوؤں کا انسلاک بھی شامل ہے۔ لیکن ان میں رند و جام ساقی و پیمانہ اور عاشقی و بوالہوسی جیسے موضوعات کو یا تو نہ کے برابر برتا گیا ہے، یا پھر انھیں نظر انداز ہی کر دیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خالد بشیر احمد نے شعوری طور پر ان موضوعات سے گریز کیا ہو۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انھوں نے سماج اور ماحول کے غم واندوہ کو اپنے اشعار کا وسیلہ تو بنایا ہے لیکن لطف و مسرت حاصل کرنے اور حظ اٹھانے کے دوسرے پہلوؤں جو کہ غم واندوہ کے متضاد پہلوؤں کی صورت میں ادیب اور فنکار کی اہمیت کی جانب توجہ مبذول کرانے کی صلاحیت موجود ہے، وہیں ادیب کی انسانی آگہی، بیداری اور سماج کے تئیں اس کی بحیثیت فرد سماجی ذمہ داریوں کے نباہ کی صورتیں بھی نمایاں ہیں۔ ان تمام حالات میں عبد معبود سے جو التجائیں کرتا ہے اور

خواہشوں کی تکمیل کی امیدیں وابستہ کرتا ہے اس یقین کو معبود کے یہاں کیا اہمیت حاصل ہے، اس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک شعر میں بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

کیسا اندیشہ میں تیری بات کیسے ٹال دوں
بھیج دے کچھ خواہشیں، کچھ التجائیں بھیج دے

دیگر گفتگو کے حوالے سے چند اشعار۔

وہ فصل سر ہے جہاں تک نگاہ جاتی ہے
جو رہ گزر ہے وہی قتل گاہ جاتی ہے

یہ کیسا دشت کا چکر ہے میرے پاؤں میں
سفر تمام ہوا اور گھر نہیں آیا

مرے لیے تو سارے موسم ایک سے تھے
دریا پار اتر کر آگے صحرا تھا

پیاس بھی ہے اور کچھ تسکین بھی
ہاتھ میں دنیا بھی ہے اور دین بھی

نشان اپنے پیچھے راستے کے سب مٹا دئے
اور اب یہاں سے لوٹنے کا اختیار دے گیا

خالد بشیر احمد اپنے اردگرد کے ماحول میں سانس لیتی زندگی کی حقیقتوں کے المیوں کو دنیا کی بیش تر جگہوں کے مسائل سے بہت مختلف اور شدید تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اپنے قرب و جوار کے مسائل سے چشم پوشی اور اپنے عہد کی زندگی سے دور ہونے والا ادب بہت جلد زوال پذیر ہو جاتا ہے اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تاریخ اکثر افسانوں پر مبنی ہوتی ہے اور ادب میں زندگی اور سماج کے تعلق سے جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں، وہ زیادہ تر تاریخی صداقت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض کی حیثیت دستاویزی ہوتی ہے۔ خالد بشیر احمد نے اپنے عہد کی ٹھوس حقیقتوں پر گہری نگاہ رکھی ہے۔ اور ان کے بیان کے تعلق سے علامتوں کا سہارا بھی لیا ہے۔ چارلس نے علامت کی بہت

عمدہ تعریف کی ہے جو خالد بشیر احمد کے اشعار سے بہت مطابقت رکھتی ہے۔ چارلس کے لفظوں میں:

''علامت نگاری تصورات اور جذبات کے اظہار کا فن ہے لیکن ان کا براہ راست بیان نہیں کیا جاتا اور نہ جسمی پیکروں کے ساتھ ان کے واضح تقابل کے ذریعہ ان کی صراحت کی جاتی ہے۔ بلکہ دوسری اشیا کے ذریعہ قاری کے ذہن میں ان خیالات کی باز آفرینی کرتے ہیں اور اس باز آفرینی میں یہ نہیں بتایا جاتا کہ یہ اشیا ان خیالات کی علامتیں ہیں۔''

(Symbolism: Charles Chandwick, London-1973 P 2,3)

خالد بشیر احمد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نپی تلی تھی رہگذر ہوائے انتقام کی
گھروں سے ابتدا ہوئی تو معبدوں پہ ختم ہے

اپنی انگلی تھامے گھر سے نکلا تھا
لوٹا اپنا آپ گنوا کے اپنے ساتھ

خوابوں سے کبھی آنکھ کے دو گھر نہیں بھرتے
بارش کے برسنے سے سمندر نہیں بھرتے
الفاظ کبھی زخم کا مرہم بھی ہوئے ہیں
دریاؤں کی گہرائی کو کنکر نہیں بھرتے

میں نے کھڑکی کھول کے گذرے وقت میں جھانکا تھا
دھول شناسائی کی اڑ کر آنکھوں میں آئی

خالد بشیر احمد نے اپنے سماج اور ماحول کی آرزومندیوں جو کہ ذات کے ایک شعور کی صورت اختیار کر چکی ہیں، کو انسان کے فطری تقاضوں سے منسلک کر کے ان کا رشتہ نئے عہد کی تلخیوں سے بھی جوڑ دیا ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں جموں و کشمیر کی تاریخ کی حقیقت نگاری کو اس طرح شعری لہجہ عطا کیا ہے کہ ذات کے اثبات اور وجود کی دریافت کا جذبہ بیک وقت محترک رکھتا ہے۔ اس طرح فکری سطح پر غور کیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ خالد بشیر احمد نے اپنی شعری کائنات کے نظام کے لیے

جوالفاظ کا ڈھانچہ مرتب کیا ہے وہ ان کے تجربات کا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے آگے جا کر الفاظ کی جمالیاتی وحدت اور اس میں پنہاں معنی کا ایک وسیع اور بسیط سلسلہ فراہم کرتا ہے جو سماجی صداقتوں کی مختلف سطحوں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ ان کی شاعری عصری اور مکانی منظر نامے کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ ابدی اور آفاقی افکار سے بحث کرتے ہوئے اپنے شعری موقف کو منطقی اساس فراہم کرتی ہے۔ چند اشعار۔

تیرا میرا ایک مقدر، میں شاعر تو ایک خیال
اس ناطے سے گلیوں گلیوں میں آوارہ دونوں ہیں

بادباں اپنی جگہ لیکن ذرا سی احتیاط
ڈوب ہی جائے نہ یہ کشتی ہواؤں میں کہیں

دوستوں والی کوئی بات نہیں ہے اس میں
اس کی ہر بات میں پہلو ہے کتابوں والا

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے کہ خالد بشیر احمد کی شاعری جہاں ذات و کائنات کے ازلی مسائل کو سامنے لاتی ہے وہیں اپنے مخصوص سماج کے ذہنی و جذباتی ماحول اور حالات و حوادث کو بھی پیش کرتی ہے۔ لیکن اس طرح کہ وہ کسی مخصوص اور متعینہ نظریے یا دستور العمل کے غالب رجحان کو اپنا شعار جذباتی طور پر نہیں بناتی بلکہ ان کا انسلاک کسی نہ کسی طور مخصوص سماج کی شعری روایت سے بھی ہے۔ ان کے خیالات کا علامتی تبدل ان کے تمام تخلیقی مظاہر میں اپنی مخصوص تہذیبی روایت کا حصہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ خالد بشیر احمد کے نزدیک انسانی عقل و عمل کا ہر وہ نیا منظر جو اپنے پس منظر کو رد نہیں کرتا، ان کی شاعری کا حصہ ہے۔ ہر وہ تجربہ جو شخصیت اور مسائل کے کسی پہلو سے ربط رکھتا ہے خواہ اس کا تعلق تاریخ سے ہو، سماج سے ہو یا انسانی عقل کے مختلف زاویوں سے خالد بشیر احمد کے نزدیک بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

آنکھ میں اب کوئی منظر نہیں بھرنے والا
چھپ گیا چاند سمندر میں اترنے والا

ظاہر باطن اک جیسا ہے، کتنے بھولے ہو
کچھ تو فرق روا رکھتے ہیں باہر اندر میں

نظر میں شخص نہیں، اس کا خواب باقی ہے
خوشی تمام ہوئی، اضطراب باقی ہے

خالد بشیر احمد نے اپنے جذبہ و فکر کے اظہار کے لیے تخلیقی اور تہذیبی روایت کے طویل سلسلوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے عہد کی حقیقتوں میں اظہار کی نئی صورتیں پیدا کی ہیں۔ اس لیے تخلیقی اور تہذیبی روایت کے طویل سلسلوں کے جستہ جستہ عناصر بھی واضح اور کبھی مبہم شکلوں میں ان کی شاعری میں در آئے ہیں۔ خالد بشیر احمد کا یہ تمام ادراک اور طرز احساس انھیں شعر و ادب میں نمایاں مقام کا حامل بناتا ہے۔

نمونۂ کلام

بہار ہو کہ خزاں آئینہ ہے آئینہ
جو دیکھتا ہے وہی بولتا ہے آئینہ

ہے کوئی اور بھی سچ بولنے کا عادی ہو
بس ایک تم ہو یا پھر دوسرا ہے آئینہ

وہ ایک چہرہ جسے پھر کبھی نہیں دیکھا
وہ ایک چہرہ بہت ڈھونڈتا ہے آئینہ

اب ایسے شخص کا جس سے کوئی نہیں ملتا
اکیلے گھر میں بڑا آسرا ہے آئینہ

اسی لیے میں کبھی اس کے منھ نہیں لگتا
میں جانتا ہوں بڑا سر پھرا ہے آئینہ

لہو لہو تھے مناظر گھروں سے آگے بھی
لٹا چکے تھے بہت کچھ سروں سے آگے بھی
کہانی کار! میرے شہر کے حوالے سے
نظر اٹھاتے شفق منظروں سے آگے بھی
ہوا کا رخ مخالف، گھنیرے بادل بھی
پرندے! سوچ لے اپنے پروں سے آگے بھی
تمام رنج تجھی سے، مسرتیں بھی تیری
گیا نہیں میں تیرے محوروں سے آگے بھی
جہاں کی حد کوئی یہ بحر ریگ و خار نہیں
گلاب کھلتے ہیں ان بنجروں سے آگے بھی

وہ خواب رکھتا ہے، آنکھیں نکال دیتا ہے
اور اس ستم پہ بھی چپ کا سوال دیتا ہے
اس اشتیاق میں ساحل پہ آ کے بیٹھا ہوں
کہ دیکھیں آج کیا دریا اچھال دیتا ہے
نہ آؤ اس کے کہے میں کہ عشق سوداگر
زر سکوں کے عوض میں وبال دیتا ہے
وہ برگ گل کی طرح خار وخس سے خوشبوئیں
نچوڑ کر مجھے حیرت میں ڈال دیتا ہے
ابھی بھی گاؤں کے چوپال میں بزرگ کوئی
وفا کے باب میں میری مثال دیتا ہے

ہوا پہ لکھا ہوا ہے دائم نوازشیں ہیں
سمندروں کے سفر میں سبزے کی خواہشیں ہیں

اجاڑ کر جو یہاں کے آنگن چلا گیا ہے
نئی نئی بستیوں میں اس کی رہائشیں ہیں

اسے میں شاید ہلاک کر کے بھلا بھی دیتا
مگر مرے ہی لہو میں اس کی سفارشیں ہیں

ہرے بھرے موسموں کی کس نے بشارتیں دیں
کہ چشم دیوار و در میں سمٹی گذارشیں ہیں

میں اپنے اندر شریر لڑکا لیے چلا ہوں
مرے قرب و جوار میں کیا نمائشیں ہیں

جو کچھ ہوا ہے وہ تیرے مرے قیاس میں تھا
ہوا تھی تیز اور انگارہ خشک گھاس میں تھا

اب اس سے زیادہ کیا حالات کو بگڑنا تھا
پناہ جسم میں آ ہوئے جاں ہراس میں تھا

جو سانحہ تھا وہ پھیلا دہائیوں پر تھا
اور اس کا تذکرہ چھوٹے سے اقتباس میں تھا

مرے سوال میں تھا سادگی کا آمیزہ
ترا جواب بڑے مشتعل لباس میں تھا

غموں سے اب مجھے رشتے نبھانے آتے ہیں
وہ ایک دور تھا جس میں بہت اداس میں تھا

دستک نہیں کسی کی یہ جھونکا ہوا کا ہے
زنجیر در کے ساتھ پھر دھوکا ہوا کا ہے

خوشبو ترے بدن کی، مرے دل کی خواہشیں
اس وصل ناتمام میں کیا کیا ہوا کا ہے

دہلیز کا چراغ بجھانے کے کھیل میں
تیرا بھی ہاتھ ہے کہ یہ تنہا ہوا کا ہے

اب اس طویل حبس کا کچھ دن کا ساتھ ہے
اس شہر سے گذرنے کا وعدہ ہوا کا ہے

تیری طرف جو یاد کی کھڑکی کھلی رہی
اس میں قصور مجھ سے زیادہ ہوا کا ہے

وہ فصل سر ہے جہاں تک نگاہ جاتی ہے
جو رہگذر ہے وہی قتل گاہ جاتی ہے
عذاب جاں ہیں یہ سارے وصال خواہش کے
دلوں سے دور مگر کب یہ چاہ جاتی ہے
زمیں پہ موسم ظلم وستم ہے وہ، جس کے
دھوئیں میں دیدۂ تر مہر و ماہ جاتی ہے
یہ وہ جگہ ہے جہاں چشم خون روتی ہے
ہوا بھی آ کے یہاں، دل تباہ جاتی ہے
جلا کے کشتیاں اب اس پہ غور کیا کرنا
کہ واپسی کے لیے کون راہ جاتی ہے

پیاس بھی ہے اور کچھ تسکین بھی
ہاتھ میں دنیا بھی ہے اور دین بھی
خواب بچوں کے بنائے پھول ہیں
ٹیڑھے میڑھے بھی مگر رنگین بھی
عشق ہے تو ناز برداری بھی ہے
اس میں ہے اعزاز بھی، توہین بھی
ذائقہ بیتے ہوئے ایام کا
تلخ بھی، نمکین بھی، شیریں بھی

اگرچہ دل کو بہت اس سے خوش گمانی ہے
میں جانتا ہوں یہ بادل بغیر پانی ہے

وہ طاق پر جلے یا رہگذر میں روشن ہو
چراغ سے ہوا کی دشمنی پرانی ہے

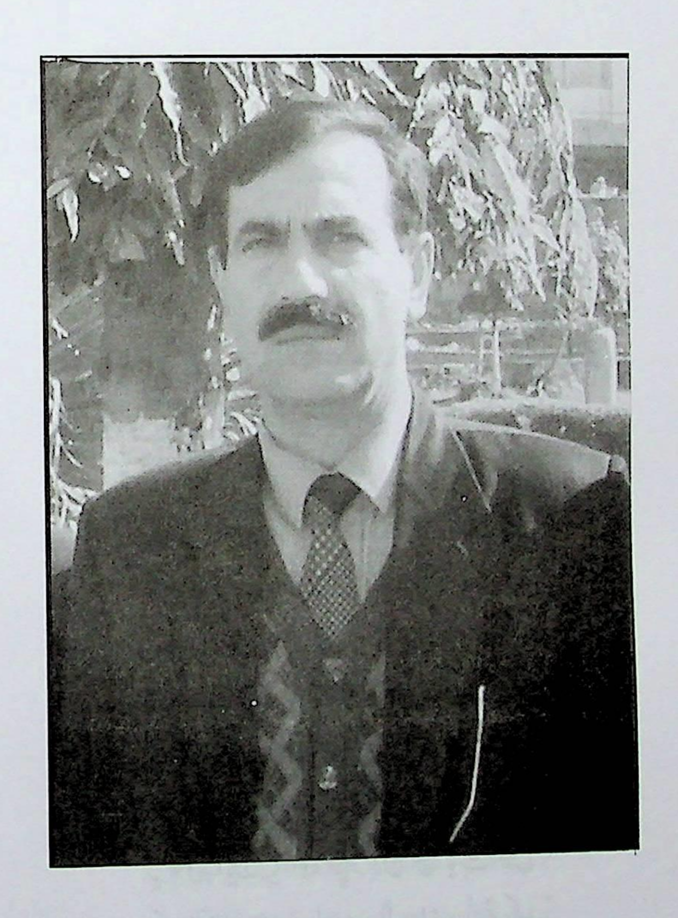
مرے لہو سے ہی اٹھی ہے اختلاف کی موج
کبھی جو میں نے تجھے بھولنے کی ٹھانی ہے

ترے کلام سے دن خوشبوؤں میں ڈوب گیا
ترے خیال سے شب ہو رہی سہانی ہے

زیاں ہے اس میں تو یوں ہی سہی مگر میں نے
جہاں پہ عقل کی سنی تھی، دل کی مانی ہے

نکاس آب تکلم محال اس نے کیا
میں لاجواب تھا ایسا سوال اس نے کیا
جو بات کی وہی دل توڑ دینے والی کی
میں چپ رہا ہوں تو اس کا ملال اس نے کیا
تمام لذتوں کو تلخیوں میں گھول دیا
کہ ایک سامرا ہجر و وصال اس نے کیا
یہ کوئی ایک یا دو، چار دن کی بات نہیں
کہ انتظار بہت ماہ و سال اس نے کیا
ترا خیال بڑا خوشنما پرندہ تھا
مگر اٹھان میں ہی انتقال اس نے کیا

نذیر آزاد



قوت اختراع کا سچا جوہری۔ نذیر آزاد

نذیر آزاد کے اشعار میں ایک بات جو توجہ انگیز ہے، وہ یہ کہ اپنے شعری موضوعات میں جو مسائل بیان کرتے ہیں، ان میں کوئی قطعی بات کہنے یا کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنے کا حکم نافذ کرنے کا رجحان نہیں ملتا۔ ان کے اشعار کا تعلق موجودہ عہد، اس میں گزرتی زندگی اور فرد کی ذات سے بہت گہرا ہے۔ اور انہیں تمام کے آئینے میں وہ اپنے شعری رجحانات کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کسی منصوبہ بندی یا مقررہ لائحہ عمل پر کار بند رہنے کا تصور ان کے یہاں نہیں پایا جاتا بلکہ تخلیقی ذہن جس موضوع کو بھی لائق تخلیق جانتا ہے، اسے اس مناسبت سے ادبی تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ شعری جامہ پہنا دیتا ہے۔

یا کہ واقف نہیں میں لذت آتش سے ابھی
یا شرر ہی کوئی شاید کسی پتھر میں نہیں

گرایا جس نے ہم کو اول اول
وہی تعمیر کرتا جا رہا ہے
کوئی ناظر نہ سامع ہے مگر دل
یونہی تقریر کرتا جا رہا ہے

رنگ و بو کچھ بھی نہیں ہے رنگ و بو کے درمیاں
کھیل ہے سارا فقط میرے لہو کے درمیاں

نذیر آزاد کے اشعار میں ان کے تجربات اور محسوسات کی نوعیت بیش تر حقیقت پر مبنی ہے حالانکہ ان میں خارجی مشاہدات کے اثرات بھی ہیں جن میں بعض حقیقت کے آگے نئی حقیقت دیکھنے اور جوڑنے کے تخیلاتی تصورات سے بھی وابستہ ہیں۔ لیکن ان کی جڑیں داخلی زندگی میں بہت گہری ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی افتاد طبع کا رشتہ فطرت کی ان حقیقتوں سے ہے جو فن پارے کی تخلیقی

شرائط کو پورا کرتی ہیں۔ اس طرح ان کے اشعار میں وہ آب ورنگ پیدا ہو گیا ہے جس کی تاثیر دیر پا ہوتی ہے۔ ان کے اشعار کا بنیادی شعری عقیدہ حسن، صداقت اور خیر کی جستجو میں مضمر ہے۔ انہوں نے ہنگامی یا وقتی ضرورت کے تحت اشعار کہنے سے حتی الامکاں گریز کیا ہے۔ اور اگر کہیں ذہنی تخلیقی ضرورت کے تحت انہیں اشعار کا حصہ بنایا بھی ہے تو اس طرح کہ عام طور پر اس کی شعری وابستگی وسعت نظر کو محدود نہیں کرتی بلکہ وسعت میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

ہم نے مانگا نہیں کچھ دل بھی عطا کرتے وہ
اب یہ پچھتاوا ہے اے کاش کہ مانگا ہوتا
عمر گزری ہے اسی ہونے نہ ہونے کے بیچ
یہ نہ ہوتا وہ نہ ہوتا کبھی ایسا ہوتا
میں سگ احمد مختار ﷺ ہوں شکراً اللہ
جو نہ ہوتا تو یقیناً سگ دنیا ہوتا

ہم حفاظت سے زر دیدۂ تر رکھتے ہیں
اور صرفے کو دل و جان و جگر رکھتے ہیں

آوازوں کے جنگل میں
یارو سب سے بہتر چپ

نذیر آزاد کے اشعار زندگی، زمانہ اور فطرت کے نامیاتی تسلسل سے منسلک ہو کر اپنے کلی وجود کی ہمہ گیریت کو سامنے لاتے ہیں۔ وہ فن کی تقویم کے سلسلے میں عصر رواں کی وارداتوں پر ہی تکیہ نہیں کرتے کیونکہ اس طرح کچھ زمانوں کے بعد تخلیقات کی معنی خیزی کے کم ہونے اور آخر کار ایک تاریخی دستاویز کی اہمیت کے ساتھ محض ادب پاروں کی شان بڑھانے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ نذیر آزاد کی پیچیدگیاں عصر رواں تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان گنت مسائل ایسے ہیں جنہیں کسی خاص زمان و مکان کی حدود میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اور ایک تخلیق کار اپنی تخلیقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے حواس اور ادراک اس کی اجازت نہیں دیتے۔ نذیر آزاد نے اپنے شعری حواس اور شعری ادراک کو کسی خارجی نظام فکر کے تابع نہیں کیا ہے کہ وہ مروجہ قدروں کے درمیان تحفظ کی راہیں ہموار کریں بلکہ داخلی احساسات اور شعری عقل ردو قبول کے مراحل سے گزرتے رہتے ہیں۔

ذرا دیکھوں کس کو ہے کھویا سفر میں
رکے تو ذرا کارواں ایک لمحہ

ہمیں نے اس کو سمندر کی سمت بھیجا تھا
ہماری طرح بشر ہے پھسل گیا ہوگا

یہ بھی دیکھا ہے سرابوں سے ہوئے سیراب لوگ
پانیوں کے ساتھ بھی بہتی ہے اکثر تشنگی
تجھ میں گر بارش سمندر کے برابر ہے تو کیا
میرے اندر بھی ہے صحرا کے برابر تشنگی

اسپ تازی، زین، زر تلوار سب موجود ہیں
زرگری کی جنگ میں احباب سارے کھو گئے

نذیر آزاد نے زندگی کے متحرک اور تغیر پذیر لمحوں کو حقیقت اور صداقت کے آئینے میں پرکھا ہے۔ اس طرح ان کی دریافت کردہ یا از سر نو دریافت کردہ حقیقت جامد نہیں ہوتی بلکہ متحرک ہوتی ہے۔ اس طرح اشعار میں تغیر پذیری کا ایک پراسرار رشتہ بھی ابھرتا ہے جو ظاہر اور باطن دونوں حالتوں کو محیط ہے۔ ان ہر دو حالتوں میں جہاں خیر اور شر کی نوعتیں بدلتی رہتی ہیں وہاں شعور زندگی کے مرحلوں کو شعری تخلیق کا حصہ بنانا کار دشوار ہے۔ اس سلسلے میں جہاں اندرونی کشمکش سے سامنا ہوتا ہے وہیں ذہنی تصادم سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے۔ نذیر آزاد نے نئی تعلیم اور نئی تہذیب سے استفادہ کرتے ہوئے تصوف اور کلاسکی قوتوں پر یقین رکھا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ان دشوار گزار راستوں پر پھسلتے نہیں۔ ان کا شعری تصور اذیت اور کرب کی اس فضا کو انحراف یا بغاوت کی صورت میں تسلیم نہیں کرتا بلکہ ایک المیے کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ اختر الایمان نے نئے عہد پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اب اس کی (نئی شاعری کی) پرانی بغاوت ایک چیخ میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ایسی چیخ جو ارض و سما کا دل چیر سکتی ہے کہ اس کے دکھوں کا مداوا کہیں بھی نہیں ہے..... یہ بے بضاعتی اور ناداری اس دور کی دین ہے۔

سائنس کی ترقی کا وہ عفریت جسے انسان نے خود تخلیق کیا ہے، اس کے قابو سے باہر ہے اور کشاں کشاں اسے موت کے دروازے پر لے آیا ہے۔ اس بات کا اظہار اس نئی شاعری کے سوا کہیں نہیں ہے۔ نیا شاعر اپنے آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اپنے آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔"

(بحوالہ نئی شعری روایت، از شمیم حنفی۔ ص ۱۰۴)

نذیر آزاد کے چند اشعار۔

کیا فوج تکلم تھی مگر مات ہوئی ہے
ہر لفظ تڑپتا ہے ہر اک بات ہے زخمی

باتیں بنا کے پہلے وہ تلوار لے گیا
پھر باندھ کر کے ہم کو سر دار لے گیا

کوہ ندا کی سمت چلے ہیں بستی کے گلفام
کس کی خاطر دوشیزائیں سہرا گاتی ہیں

مجھ کو لوٹا دو وہ تلوار و سپر وہ دستار
میں نے اجداد کے کب تم سے خزانے مانگے

کچھ خواب سا ہے سامنے یا دشت گماں ہے
تصویر ہے یا ریت ہے یا آب رواں ہے

نذیر آزاد نے اپنے شعری موضوعات میں ان ثقافتی اور دانش ورانہ زندگی کے عناصر کا احاطہ کرنے کی کوششیں کی ہیں جو اپنی متنوع صورتوں میں مختلف تضادات کے باوجود کم از کم ایک ایسا بنیادی رابطہ ضرور رکھتے ہیں جو اجنبیت یا تنہائی کی فضا سے منسلک ہے۔ یہ فضا انسانی عوامل سے ماورا نہیں ہے۔ آج کے دور کا تجزیہ کیا جائے یا پچھلے ۲۰۰۔۱۰۰ سال سے آج کے دور کو منسلک کر کے بھی دیکھا جائے تو انسانی زندگی میں تنہائی کا حلقۂ اثر بڑھا ہے۔ یہ تنہائی کہیں خارجی شکل میں نمایاں ہوتی ہے تو کہیں داخلی سطح پر اندرون کو متاثر کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ذہنی طور پر انفرادی جبلت اور سماجی

ضروریات کی کشمکش، ذات اور غیر ذات کا تصادم، حقیقت کی ترسیل کے لیے بعض اوقات زبان کی عدم تکمیلیت، فنی ہیئت کا وسیع منظر پر کم اعتمادی ہونا اور شہری زندگی میں بے یقینی کے خطرات سے صرف نظر ممکن نہیں۔

فاصلہ یوں تو بس مکاں بھر تھا
لیکن اپنا سفر جہاں بھر تھا
دھوپ دل میں فقط گماں بھر تھی
ابر آنکھوں میں آسماں بھر تھا

ہم جیسے درویشوں کی خاطر روح و بدن کی قید کہاں
بادِ صبا سے گھنٹوں بولے گل سے پہروں کلام کیا

بڑی ہی دیر میں جانا کہ یہ بھی دریا ہے
سمجھ لیا تھا جسے میں نے راستہ سا کچھ

گل زمینوں پر جو تپتی آج اتنی دھوپ ہے
ہو نہ ہو نکلے گا یاں ہی سے سمندر ایک دن

نذیر آزاد کے شعری لہجے اور اظہار کی نوعیت کو تنقیدی نکتۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان کی شاعری میں مختلف سماجی اور واقعاتی زاویۂ نظر کے پہلو بہ پہلو ارتقا پذیر ہونے کے دلائل ملتے ہیں۔ ان کے بیان کردہ مختلف تجربات و کوائف تنقیدی سطح پر مختلف مسائل سے متعلق کسی نہ کسی ایسے افادی رویے کی ترجمانی کرتے محسوس ہوتے ہیں جن کا مستحکم انسلاک مشرق کے مخصوص تہذیبی اور سیاسی مطالبات سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کے عہد کو سائنسی تہذیب کے عروج کا عہد کہا جاسکتا ہے۔ اس عروج نے جہاں طرزِ حیات کو کافی تبدیل کر دیا ہے وہیں تمدنی اقدار بھی اس کے نرغے میں آگئے ہیں۔ اس طرح ایک قسم کی گھٹن اور بے جا دباؤ نے غم و غصے کی ہیجانی کیفیت کو وجود بخشا اور اسی سے تفکر کا آہنگ بھی کبھی دب کر اور کبھی نکھر کر سامنے آیا ہے۔ جس نے غیر منطقی ماحول کو تخیلاتی اور تصوراتی سطح پر ہی سہی منطقی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح جو تخلیق ابھر کر سامنے آئی اس نے اپنے ہونے کا جواز اور معیار دونوں پیش کیا ہے۔

ذرا آشفتگی سر میں ہو، تھوڑی تیرہ بختی ہو
تو اک کردار کا افسانہ در افسانہ بنتا ہے

ذرا دیکھو کہ منظر آسماں کے پار بھی تو ہے
سفر ہے شرط تھوڑا جسم و جاں کے پار بھی تو ہے

وہاں اس روشنی کے پار بھی سورج ہی سورج ہیں
مقام ذات سے گذرا تو شہر لامقام آیا

مرا وجود علامت مرے عدم کی ہے
مجھے نہ ڈھونڈ وہاں پر جہاں میں رہتا ہوں

شمس الرحمٰن فاروقی نے نذیر آزاد کی شاعری کے تعلق سے لکھا ہے:

''نذیر آزاد کی دو صفتیں ان کے کلام کو ممتاز کرتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ مضمون کی تلاش میں رہتے ہیں اور یہ تلاش ان کے یہاں دیوانگی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ وہ نئی بات ڈھونڈتے رہتے ہیں اور پرانی باتوں کو نئے ڈھنگ سے دیکھنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ دوسری صفت ان کی یہ ہے کہ وہ اپنے اور اپنی وادی پر، اپنے اہل وطن پر گذرنے والی واردات کو کسی اخباری خبر یا سیاسی تبصرے کی طرح نہیں بلکہ شعر کے روپ میں بیان کرتے ہیں۔ نذیر آزاد نے نظموں میں نسبتاً زیادہ واضح اسلوب اختیار کیا ہے اور ان میں ان کا ذاتی کرب اور کشمیر کا کرب یکجا ہو کر کچھ آفاقی سا رنگ اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن نذیر آزاد کی قوت اختراع کے سچے جوہر ان کی غزلوں میں کھلتے ہیں جہاں نئے ردیف و قوافی سے لے کر نئے الفاظ اپنی جلوہ گری دکھاتے ہیں۔''

یہ تمام صفات مل کر نذیر آزاد کی بحیثیت ایک شاعر جو تصویر پیش کرتی ہیں، اسے دیکھتے ہوئے ان کا مستقبل اردو ادب میں بہت روشن اور تابناک نظر آتا ہے۔

نمونۂ کلام

ارشاد ہوا مجھ سے کہ باطل سے الجھنا
در پردہ یہ ہے رمز فقط دل سے الجھنا
صیاد کے آئیں میں یہی درج ہے دیکھا
ہر صید زبوں ہر تن بسمل سے الجھنا
الجھن ہے مقدر میں شب ہجر کی یارو
حاصل بھی ہوا یار تو حاصل سے الجھنا
آزاد زباں بند ہی رکھ گھر میں پڑا رہ
کیا فائدہ ہے شہر کے جاہل سے الجھنا

کوئی زنجیر کرتا جا رہا ہے
مجھے تسخیر کرتا جا رہا ہے
گرایا جس نے ہم کو اول اول
وہی تعمیر کرتا جا رہا ہے
کوئی ناظر نہ سامع ہے مگر دل
یونہی تقریر کرتا جا رہا ہے
معافی دو اسے ناداں سمجھ کر
کہ دل تقصیر کرتا جا رہا ہے
حدیث دل پرانی ہے مگر وہ
نئی تفسیر کرتا جا رہا ہے
سخن ہی کا وظیفہ ہم کو آزاد
مرید میر کرتا جا رہا ہے

قاتل چپ ہے خنجر چپ
سب کچھ اندر باہر چپ
فاتح تھا تو شور کیا
پسپا ہوکر لشکر چپ
اکتائے ہیں شام سے ہی
بیٹھے رات برابر چپ
چوک کی مسجد بھی خاموش
چوراہے کا مندر چپ
کیسا محشر ہے برپا
عاصی چپ اور داور چپ
آوازوں کے جنگل میں
یارو سب سے بہتر چپ

یہ وہم و یقین و گماں ایک لمحہ
کہ ہے فرصت دو جہاں ایک لمحہ
کوئی برق تھی جو گری نہر دل پر
اٹھا نخل جاں سے دھواں ایک لمحہ
ذرا دیکھوں کس کو ہے کھویا سفر میں
رکے تو ذرا کارواں ایک لمحہ
کہا میں نے کہہ داستاں رات بھر کی
کیا اس نے لیکن بیاں ایک لمحہ

ذرہ ذرہ کربلا منظر بہ منظر تشنگی
اپنے حصے میں تو آئی ہے سراسر تشنگی

یہ بھی دیکھا ہے سرابوں سے ہوئے سیراب لوگ
پانیوں کے ساتھ بھی بہتی ہے اکثر تشنگی

ہو گئیں پلکوں سے ہی رخصت وہ موجیں خواب کی
ڈیرا ڈالے ہے یہاں آنکھوں کے اندر تشنگی

تجھ میں گر بارش سمندر کے برابر ہے تو کیا
میرے اندر بھی ہے صحرا کے برابر تشنگی

اس مہذب شہر میں آداب ہیں کچھ جشن کے
رقص کرتی ہے یہاں نیزوں کے اوپر تشنگی

کیوں ہماری چھت کے اوپر بادلوں کا شور ہے
کیا ہمارے گھر میں جائے گی مکرر تشنگی

باتیں بنا کے پہلے وہ تلوار لے گیا
پھر باندھ کر کے ہم کو سردار لے گیا
زندان ظلم و جور میں رکھنا تھا عمر بھر
دام ہوا میں کر کے گرفتار لے گیا
کر کے تعلقات کی خلعت کو تار تار
میرے گلے سے ہیکل پندار لے گیا
ایماں میں وہ خلوص نہ وہ لطف کفر میں
عہد جفا تو سبحہ و زنار لے گیا
دست دعا کی طرح کٹے گھر کے سب چنار
خوابوں کی طرح کون وہ دیوار لے گیا
کس نے گرائی برف شگوفوں پہ سیب کے
کیسر سے مشک گیسوئے خم دار لے گیا
سینے پہ ڈل کے کس نے بچھا دی ہیں آندھیاں
جہلم کی ساری شوخی رفتار لے گیا

فاصلہ یوں تو بس مکاں بھر تھا
لیکن اپنا سفر جہاں بھر تھا

دھوپ دل میں فقط گماں بھر تھی
ابر آنکھوں میں آسماں بھر تھا

آنکھ بھر عشق اور بدن بھر چاہ
شکر لب بھر گلہ زباں بھر تھا

کیا ملا جز سکوت بے پایاں
شور سینے میں کارواں بھر تھا

مژدۂ وصل تھا بس اک فقرہ
خوف اعدا تو داستاں بھر تھا

ہاں یہ سچ ہے خاک میں ہوگا یہ پیکر ایک دن
ساتھ لے جاؤ گے اپنے لاؤ لشکر ایک دن

گل زمینوں پر جو تپتی آج اتنی دھوپ ہے
ہو نہ ہو نکلے گا یاں ہی سے سمندر ایک دن

اختلاف پست و بالا ہے نگاہوں کا فریب
سحر ٹوٹے گا تو ہوگا سب برابر ایک دن

ہر کس و ناکس کو سجدے کیوں بھلا کرتا پھروں
تم جو کہہ دو کاٹ کر رکھ دوں میں یہ سر ایک دن

میری عریانی وہ ڈھانپے گا ردائے نور سے
یاد رکھنا تم بھی دیکھوگے یہ منظر ایک دن

ذرا دیکھو کہ منظر آسماں کے پار بھی تو ہے
سفر ہے شرط تھوڑا جسم و جاں کے پار بھی تو ہے

ضروری تو نہیں ہر لفظ تم پر منکشف ہو جائے
کہ اک کردار طول داستاں کے پار بھی تو ہے

ابھی سے ماتم فصل بہاراں ہے نہیں جائز
گل افسردگی فصل خزاں کے پار بھی تو ہے

بہت روئے ہو لیکن دفتر غم تہ نہیں کرنا
ابھی اک بحر خوں آہ و فغاں کے پار بھی تو ہے

نہیں محدود بس اس خاکداں تک عشق کی شورش
صدائے درد جاری لامکاں کے پار بھی تو ہے

عروض و معنی و علم بیاں اسلوب سب بر سر
سخن پنہاں کوئی زور بیاں کے پار بھی تو ہے

مجھے پھر شاعر مشرق کی محفل سے پیام آیا
نظر میں پھول مہکے دل میں یار خوش خرام آیا

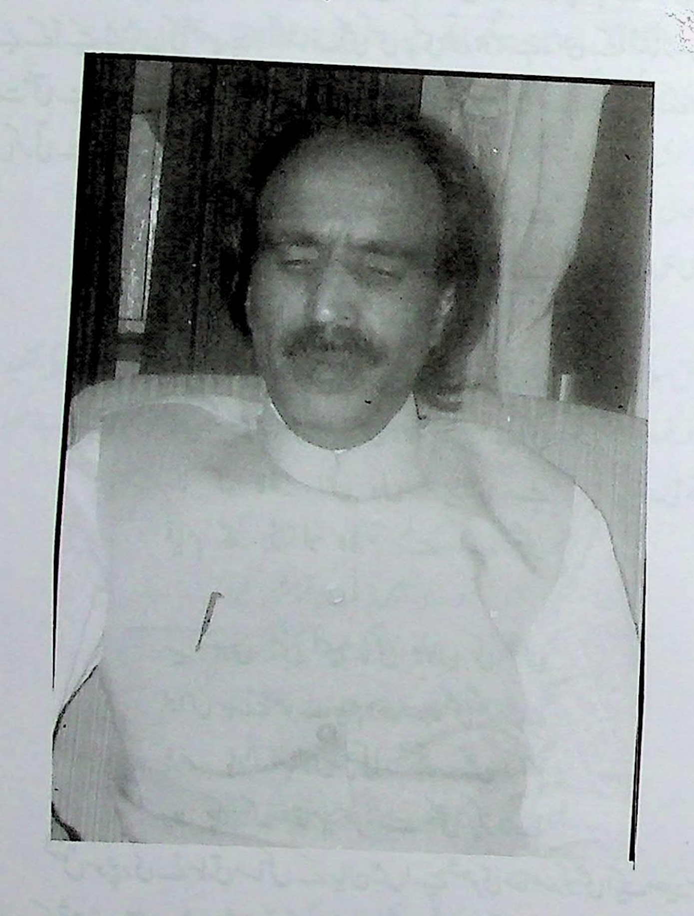
وہاں اس روشنی کے پار پھر سورج ہی سورج ہیں
مقام ذات سے گذرا تو شہر لامقام آیا

ہمارا کوزہ گر جانے کہ ہم جانیں کہ جانے چاک
تمہارے ہاتھ جو آیا تو اک لبریز جام آیا

غبار رہگذر کو رہگذر کا رزق ہونا تھا
قدم تیز بھی صد افسوس کچھ اپنے نہ کام آیا

خیال وخواب، سودائے سفر، صحرا ہے پھر دل میں
''مجھے آہ و فغاں نیم شب کا پھر پیام آیا''

شفق سوپوری



شفق سوپوری کی شعری خصوصیات

شفق سوپوری کے اشعار فطرت اور انسان کے باہمی تعلق کو ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں جو ان کے مخصوص شعری مزاج کو سمجھنے میں بھی معاون ہے۔اس سے آگے چلا جائے تو ان کے شعری تجربے کے آئینے میں ان کی شخصیت کا انکشاف بھی کسی نہ کسی طور ہوتا ہے۔ان کے اشعار میں جو فضائی کیفیت ملتی ہے، وہ فطرت کے رابطوں کو رمزیت کے پیرائے میں پیش کرنے کے ان کے ہنر کو بخوبی نمایاں کرتی ہے۔

چمن سے لوٹ کے دیوار و در سے بھی گزرے
صبا ضروری نہیں ہے، ادھر سے بھی گزرے

مرے سخن میں غم دل کی ترجمانی ہے
میں ہم کلام ہوں ہر خاص و عام سے اب بھی
سنا کہ قافلۂ اہل دل گریزاں ہے
قیام گاہ فنا و دوام سے اب بھی

سیہ شبوں میں کسی ماتمی جلوس کی شکل
اداس سائے مرے بام و در سے بھی گزرے
ہزار بار اجالوں کی جستجو میں ہم
پتہ چلا کہ مقام سحر سے بھی گزرے

شفق سوپوری نے سماجی مسائل کے بیان میں اپنے شعری مقاصد کو بھی ایک معینہ سمت دی ہے۔ان کے شعری مقاصد میں انسان کے مادی اور جسمانی وجود کی احاطہ بندی ہی نہیں ذہنی اور جذباتی مسئلوں کو اقتصادی رشتوں سے مربوط رکھنے کے باوجود اس سے آگے زاویۂ نظر کی وساطت کا پھیلاؤ ہے۔یہ ذہنی وساطت کبھی خوف کے مراحل سے گزرتی ہے تو کبھی مصنوعی سکون کے اندر پوشیدہ انتشار سے بھی آنکھیں چار کرتی ہے۔شعری موضوع کے حوالے سے غور کیا جائے تو خوف اور انتشار

قومی اور تہذیبی حرمتوں کی شکست کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان میں کبھی خوف کا حلقۂ اثر وسیع ہوتا ہے اور کبھی انتشار کا۔ افتخار جالب نے انتشار اور خوف کے دائرۂ کار کو تخلیقی ادب میں شامل کرنے اور معاشرے کے توسط سے تخلیقی ذہن پر اس کے اثرات کا بیان اپنے الفاظ اور اپنی تخلیقی شخصیت کے آئینے میں یوں کیا ہے:

> ''مکمل انتشار سے خوف زدگی بجا، پھر بھی تھوڑا بہت انتشار تو ضرور چاہیے۔ انتشار کا مکمل فقدان گہما گہمی اور رنگا رنگی کی نفی ہے، ایک قید ہے۔ ایسی قید سے طبیعت گھبراتی ہے۔ صدیوں سے مخصوص رابطوں میں بندھی ہوئی زندگی سخت قید ہے۔ مجھے آزادی چاہیے۔ تھوڑی سی سہی بہر حال آزادی چاہیے..... اسی الٹ پلٹ، انتشار، پیچیدگی اور پھیلاؤ میں میری روحانی آبرو ہے۔ میں یہ کام کیے جاؤں گا۔ اپنی پریشان اور مضطرب دنیا کچھ ایسی ہی بنتی ہے۔''
>
> (افتخار جالب، تنہائی کا چہرہ، ص ۴۱)

شفق سوپوری کے یہاں کم وبیش یہی صورت موجود ہے۔ لیکن اسے افتخار جالب کی تقلید کے طور پر نہیں دیکھا جاسکتا بلکہ یہ آفاقی فطری معاملات ہیں جو ہر تخلیق کار کے ذہن پر اپنے اپنے طور اثرانداز ہوتے ہیں۔

شہر امکاں کے کم آگاہ تماشائی کو
گم کہیں ہونے نہیں دیتا تماشا تیرا
کسی منزل سے مسافر کو صدا آتی ہے
کھل ہی جاتا ہے کسی سمت سے رستا تیرا
یہ کہاں دیکھتا ہے تیری سخاوت کا وفور
مجھ سے پورا نہیں ہوتا ہے تقاضا تیرا

نیا ہی روز کوئی انکشاف کرتے ہیں
ہم اپنے آپ سے ہی اختلاف کرتے ہیں
سفر میں ہیں مگر ان کی نہیں کوئی منزل
یہ لوگ سائے کا اپنے طواف کرتے ہیں

شفق سوپوری کے شعری پس منظر میں عصری آگہی کا بہت دخل ہے۔ ان کے شعری مطالبات ان کی تخلیقی قوت کو اس طور متاثر کرتے ہیں کہ تہذیبی روایات اور اساطیر کے آئینے میں موجودہ عہد اور ذات و کائنات کے توازن کا سراغ لگانے کی جستجو ان کے تخلیقی عمل کا ایک ناگزیر حصہ محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے تہذیب اور تاریخ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے سماج کی تہذیبی اور روحانی توسیع کا ذریعہ تصور کیا ہے۔ شاعری کے توسط سے نئے جمالیاتی افقوں کی جستجو کا عمل زندگی کے موجود اور لاموجود (جن کا کہ آگے امکان بن سکتا ہے) کے معنوی انسلاک کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ان کے تخلیقی اظہار میں اپنے سماج اور معاشرے کا ایک نامعلوم کرب بھی موجود ہے، جس کی جڑیں صدیوں کی تاریخی تہوں میں اندر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس طرح ان کے اشعار معنویت کے اعتبار سے مختلف ہیں اور شدید اثر رکھتے ہیں۔

کسی حسین خریدار کے بھروسے پر
ہم اپنے آئینۂ دل کو صاف کرتے ہیں

یہ دل کسی کے خیال حزیں سے روشن ہے
فضا مکاں کی اکیلے مکیں سے روشن ہے
یہ بار بار گریباں کو دیکھتے ہو کیا
مرا لہو تو تری آستیں سے روشن ہے

میں اپنے آپ کو پہچاننے سے ڈرتا ہوں
یہ واردات بھی ہوتی ہے شام سے پہلے
ضرور راز جہاں کا نیاز پاؤ گے
شکستگاں سے ملو احترام سے پہلے

شفق سوپوری نے انسانی تجربات کو خیر و شر کے انسانی عمل کی مختلف ہیتوں کے پس منظر میں بھی برتا ہے۔ یہاں بنیادی مسئلہ اظہار کی نوعیت اور اس کی معنویت کی تبدیلی نہیں ہوتی اس لیے کہ سماجی اور تمدنی رشتوں کی وضاحت و صراحت کے لیے وہی شعری پیکر کام دیتے ہیں جو تجربات کی فنی قدر و قیمت سے مربوط ہیں۔ ان کے اشعار کے معنی خیز پہلوؤں میں زمان، مکان اور شخصی حصار سے آگے دیکھنے کا جو رجحان ملتا ہے، وہ فکری تناظر کے اعتبار سے اس وسعت اور کشادگی کا طالب نظر آتا

ہے جو جمالیاتی کل سے آگے کا قدم کہا جا سکتا ہے۔

نہ پہرے دار نہ لوگوں کا شور کرتا ہے
مجھے تو نیند سے بیدار چور کرتا ہے
کسی کی فکر مرے ہر عمل کے پیچھے ہے
دراصل کام مرا کوئی اور کرتا ہے
پھر ایک بار لٹا ہے، پھر ایک بار یہ دل
معاملات محبت پہ غور کرتا ہے

خوف و دہشت دلوں پہ طاری ہے
جنگ لڑنے سے پہلے ہاری ہے
بادشاہی کا دور ختم ہوا
بادشاہوں کا حکم جاری ہے

شفق سوپوری کے یہاں اپنے مخصوص ماحول کے سیاسی اور سماجی موضوعات کو اپنی داخلی شخصیت سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش نہیں ملتی۔ یہاں ان کی مخصوص افتادِ طبع کی کارفرمائی محسوس ہوتی ہے۔ خارجی زندگی کے ادراک کے سلسلے میں ان کے افکار و تصورات جو جمالیاتی پیکر اختیار کرتے ہیں وہ ان کی ذکی الحسی کا عطیہ ہیں جو زندگی کے تیز و تند جذبات، کرب و اضطراب اور نشیب و فراز کی مختلف منزلوں کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کے تخلیقی ذہن میں بعض ایسی تلخی کے عناصر بھی ملتے ہیں جو اس کشمکش پر قابو پانے کی کوئی مثبت صورت پیدا کرنے کی بجائے مزید پیچیدگی اور الجھاوے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے سیدھی سادی غزلیہ شاعری پر گزارہ نہیں کیا ہے جو مقبولِ عام اور مروجہ چند جذبات و محسوسات اور سامنے کے خیالات کو بنے بنائے سانچوں میں ڈھال دیتی ہے۔ بلکہ ان کے اشعار ان کے اس عمیق مطالعے کا نتیجہ ہیں جو ان کی تخلیقی شخصیت کی نشو و نما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

صرف اک وہم کا دھندلکا ہے
تو نہ نوری ہے اور نہ ناری ہے

پھر کوئی راستہ نہ سوجھے گا
ابھی باقی ہے دن، نکل جاؤ

وقت کو گر بدل نہیں سکتے
وقت کے ساتھ تم بدل جاؤ

کچھ نہیں ہم سوائے مصنوعات
کارخانہ یہ سب اجل کا ہے
دخل تقدیر میں ہر انساں کو
صرف پابندئ عمل کا ہے

شفق سوپوری کی شعری کائنات کا رشتہ کسی معینہ نظریے یا عقیدے سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ طرزِ احساس کی تازہ کاری کے سبب ان کے اشعار فکر کی پختگی کے بھی بیش تر تقاضے پورے کرتے ہیں اور فنی تکمیل کے بیش تر تقاضوں کو بھی۔ وہ تاریخی واقعہ کو موضوع بنائیں یا ذاتی جذباتی واردات کو، ٹھوس استعاروں اور نمایاں پیکروں کا انتخاب حسی اور نفسیاتی کوائف کی عکاسی بخوبی کرتا ہے۔ ان کی شعری تکملیت کا یہ راستہ جذبے کی تحلیل کے مراحل سے ہو کر گزرتا ہے۔ ان مراحل کی تشکیل میں حالات کی تبدیلی سے پیدا شدہ نئی حسیت کا نمایاں دخل ہے۔ انسانی زوال کا المیہ جو بعض عالم گیر شعوری ادراک کی گمرہی اور ناکامی سے عبارت ہے، شفق سوپوری کے اشعار میں یوں ظاہر ہوا ہے۔

نہیں ہے کچھ بھی اگر اعتبار، فرض کرو
نسیم صبح کو موج غبار فرض کرو

آگہی ہے حد آشفتہ سری کہتے ہیں
شوق کو مرحلۂ دربدری کہتے ہیں
جنبش کاہ بتاتی ہے زمانے کا مزاج
اہل ادراک ہوا کو خبری کہتے ہیں

ہم اہل علم وفضل بھی پھرتے ہیں ایسے خوار
جیسے ہماری شہر میں کچھ آبرو نہ ہو

شفق سوپوری کی ان شعری خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے قلم سے مزید اعلیٰ معیاری تخلیقات کی توقع کی جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

نمونۂ کلام

چمن سے لوٹ کے دیوار و در سے بھی گذرے
صبا ضروری نہیں ہے ادھر سے بھی گذرے

کسی خوشی کا حوالہ صحیفۂ دل میں
اگر کہیں ہے تو میری نظر سے بھی گذرے

وہ سرسری ہی سر راہ پوچھتا ہے حال
اسے کہو کہ کبھی میرے گھر سے بھی گذرے

غبار اپنی تمناؤں کا اڑاتے پھرے
مسافران محبت جدھر سے بھی گذرے

ہر ایک پھول کہ شعلہ، ہر اک شاخ سناں
ہم ایسے موسم خوف و خطر سے بھی گذرے

سیہ شبوں میں کسی ماتمی جلوس کی شکل
اداس سائے مرے بام و در سے بھی گذرے

ہزار بار اجالوں کی جستجو میں ہم
پتہ چلا کہ مقام سحر سے بھی گذرے

ڈرا رہا ہے شفق دور دور سے ہی کیا
کبھی یہ سیل بلا میرے سر سے بھی گذرے

بہت نواز رہا ہے پیام سے اب بھی
مرے تیئں غرض اس کو ہے کام سے اب بھی

مرے سخن میں غم دل کی ترجمانی ہے
میں ہم کلام ہوں ہر خاص و عام سے اب بھی

اجاڑ دل ہے و لیکن گذشتگاں کی صدا
سنائی دیتی ہے دیوار و بام سے اب بھی

سنا کہ قافلۂ اہل دل گریزاں ہے
قیام گاہ فنا و دوام سے اب بھی

نہیں ہے وقت کی رفتار گومگو واقف
مرے مزاج قیام و خرام سے اب بھی

گرچہ ہر سو نظر آتا ہے سراپا تیرا
میری آنکھوں میں سماتا نہیں جلوہ تیرا

چمن آرا! پس آسودگیٔ برگ سکوت
ایک ہنگامۂ پر شور ہے برپا تیرا

شہر امکاں کے کم آگاہ تماشائی کو
گم کہیں ہونے نہیں دیتا تماشا تیرا

کسی منزل سے مسافر کو صدا آتی ہے
کھل ہی جاتا ہے کسی سمت سے رستا تیرا

یہ کہاں دیکھتا ہے تیری سخاوت کا وفور
مجھ سے پورا نہیں ہوتا ہے تقاضا تیرا

اور بھی منتظر دید ہیں عالم لیکن
درمیاں صورت آئینہ ہے پردہ تیرا

مجھ کو بالکل بھی اکیلا نہیں ہونے دیتا
میں جہاں جاؤں مرے ساتھ ہے سایا تیرا

ایک جانب سر اٹھاتا ہے بگولوں کا ہجوم
اک طرف آ کے رواں ہوتا ہے دریا تیرا

نیا ہی روز کوئی انکشاف کرتے ہیں
ہم اپنے آپ سے ہی اختلاف کرتے ہیں
سفر میں ہیں مگر ان کی نہیں کوئی منزل
یہ لوگ سائے کا اپنے طواف کرتے ہیں
ذرا سی دیر کو دکھتا ہے دل، پر آخر کار
ہم اہل درد ہیں سب کو معاف کرتے ہیں
کسی حسین خریدار کے بھروسے پر
ہم اپنے آئینۂ دل کو صاف کرتے ہیں
بچا جنوں میں جو پر کالۂ گریباں کچھ
اسے صحیفۂ غم کی غلاف کرتے ہیں
سجا سجا کے حسینوں کے جسم پر زیور
ستم ہمارے یہاں کے صراف کرتے ہیں
تمہاری آنکھ سے مخمور ہونے والے اب
تمہیں خبر ہے تقاضائے ناف کرتے ہیں

یہ دل کسی کے خیال حزیں سے روشن ہے
فضا مکاں کی اکیلے مکیں سے روشن ہے
وہ ایک گم شدہ لمحے کا آفتاب گماں
پھر آج مطلع جاں پر کہیں سے روشن ہے
یہ بار بار گریباں کو دیکھتے ہو کیا
مرا لہو تو تری آستیں سے روشن ہے
ہمارے حال سے واقف ہے بس خدا ہی مگر
تمہارا حال تمہاری جبیں سے روشن ہے
کسی امید کا تارہ یہیں پہ ٹوٹا تھا
مگر یہ راستہ دل کا یہیں سے روشن ہے
اسی مقام پہ شاید بچھڑ گئے تھے ہم
یہاں زیادہ گماں ہی یقیں سے روشن ہے

سپرد باد ہوا دل قیام سے پہلے
اڑی یہ خاک کسی کے خرام سے پہلے
میں اپنے آپ کو پہچاننے سے ڈرتا ہوں
یہ واردات بھی ہوتی ہے شام سے پہلے
کیے ہیں اہل جنوں کے حقوق میں نے بحال
اک انتشار سا تھا اس نظام سے پہلے
ضرور راز جہاں کا نیاز پاؤ گے
شکستگاں سے ملو احترام سے پہلے
بدل کے بھیس کبھی حال جاننے کے لیے
سوال کرتے تھے والی عوام سے پہلے

نہ پہرے دار نہ لوگوں کا شور کرتا ہے
مجھے تو نیند سے بیدار چور کرتا ہے
کسی کی فکر مرے ہر عمل کے پیچھے ہے
دراصل کام مرا کوئی اور کرتا ہے
پھر ایک بار لٹا ہے، پھر ایک بار یہ دل
معاملات محبت پہ غور کرتا ہے
کبھی وہ خار چبھوتا ہے تن کے چھالوں میں
کبھی جھلتی ہوا سے ٹکور کرتا ہے

خوف و دہشت دلوں پہ طاری ہے
جنگ لڑنے سے پہلے ہاری ہے
بادشاہی کا دور ختم ہوا
بادشاہوں کا حکم جاری ہے
آدمی کو کہاں نچاتا ہے
وقت سب سے بڑا مداری ہے
وہ نشانے کی مشق کرتے ہیں
سوجا بچے! یہ چاند ماری ہے
صرف اک وہم کا دھندلکا ہے
تو نہ نوری اور نہ ناری ہے

سنگ جو بھی ترے محل کا ہے
اس میں عنصر کوئی خلل کا ہے
صبح کے بام پر ستاروں کی
راکھ کا دور تک دھندلکا ہے
کچھ نہیں ہم سوائے مصنوعات
کارخانہ یہ سب اجل کا ہے
دخل تقدیر میں ہر انساں کو
صرف پابندئ عمل کا ہے
میری پیاسی زمین کے اوپر
کچھ دنوں سے اک ابر ہلکا ہے

آگہی ہے، حد آشفتہ سری کہتے ہیں
شوق کو مرحلۂ دربدری کہتے ہیں

ہم سمجھتے ہیں اسے خاک کش کوئے نگار
لوگ جس چیز کو باد سحری کہتے ہیں

جنبش کاہ بتاتی ہے زمانے کا مزاج
اہل ادراک ہوا کو خبری کہتے ہیں

دل وہ معمورۂ حیرت ہے کہ جس کے نگراں
چشم کو مانع روشن نظری کہتے ہیں

ہاں یہی جھیل ہے وہ، ہاں اسی پانی میں شفق
اک زمانے میں اترتی تھی پری کہتے ہیں

حسن انظر



حسن انظر کا تخلیقی سفر

حسن انظر نے اپنی جدید شاعری کی تعمیر میں ان ادبی میراث کو نظر انداز نہیں کیا ہے جو جدید حالات کی تعبیر اور اس کی ترجمانی کے سلسلے میں رمز و علامات اور اشاروں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری میں ان ادبی میراث کی جدید حس کو اپنی تخلیقی حس کے ساتھ منسلک کرنے کا جو رجحان ملتا ہے، وہ ان کے شعری بیان کو ایک تبصرے کی شکل دے دیتا ہے۔ چند اشعار ؎

دعا کرنا محاذ زندگی سے سرخرو ہو کر
ترا انظر، ترا شاعر، ترا آشفتہ سر آئے

رفتہ رفتہ خوف گہرے پانیوں کا ڈھل گیا
ناؤ میں اب ڈولتا ہوں رات کے پچھلے پہر

حد سے زیادہ بے غرض کیوں ہوں میں پاگل تو نہیں
ان کے دل میں کیا یہی معقول شک ہے آج بھی

قبیلے والو تمہارے چہرے بجھے بجھے سے ہیں اس قدر کیوں؟
ابھی تلک تو ہے اپنے سینوں میں رحمتوں کی کتاب روشن

گولیوں کی بے سبب بوچھار ہے
گھر گیا بے آسرا پاگل کوئی

حسن انظر نے اپنی تخلیقی حسیت اور ادبی رشتوں کو ظاہر کرنے کے لیے تخلیقی ذہن کی کسی مخصوص رو اور شعور کی کسی مخصوص بصیرت پر اصرار نہیں کیا ہے۔ انہوں نے ماضی کے بدلے ہوئے رویوں جو کہ حال کی صورت میں سامنے ہیں، کو اپنے فن کے مختلف تصورات کے ساتھ اپنی تخلیقات میں

برتا ہے۔انہوں نے ادب کے آہنگ اور عام بول چال کے آہنگ کو توازن کے ساتھ استعمال کر کے زبان کے اس اسلوب کو نمایاں کیا، جو معتبر فن کاروں کا محبوب اسلوب رہا ہے۔اپنے شعری متن کے فطری پن کو برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے شعری ساخت کے رنگ و آہنگ کو شہروں کے مخصوص نظریۂ زندگی اور دور دراز کے پس ماندہ طبقوں کے نظریۂ حیات سے منسلک کر کے اپنی تخلیقی فضا کو استوار کیا ہے۔

ہر تجربہ آجائے گا خود ہی کلام میں
پہنچائے گی اپنی نظر طائر کو دام میں
ہنگامہ تیرے میکدے میں کیوں ہے ساقیا
تقسیم کا پھر نقص ہے شاید نظام میں

ہو سکے تو بے وجہ ٹکراؤ سے بچتے رہو
رخ زمانے کی ہوا کا کس طرف ہے دیکھنا

مرے شریک سفر مری شرط ہے تو اتنی
کسی بھی منزل پہ اپنی غیرت بحال رکھنا

دیکھ لینا خود بہ خود وہ ایک دن پچھتائے گا
دشمن اردو کا دل بھی ہے طرفدار غزل

حسن انظر کے اشعار میں انسانی وجود کو معنی و مقصد سے ہم کنار کرنے کی جو کوششیں ملتی ہیں، وہ نفسی اور حسی تبدیلیوں کے تخلیقی عمل میں ذات کے اظہار و نمود کے پیچیدہ منطقی تجربات کے زیر اثر ہیں۔حسن انظر بیرونی صداقت اور تجربے کے اظہار میں انفرادی رشتے کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بعض مقامات پر خود کلامی کی تکنیک کو بھی برتتے ہیں۔اس کے سبب بیرونی تجربے کہیں بہت نزدیک اور کہیں قدرے فاصلے پر بھی یکساں اہمیت کے حامل معلوم ہوتے ہیں۔حسن انظر بخوبی واقفیت رکھتے ہیں کہ شاعری اپنی ذات کی عکاسی کا فن تو ہے ہی، لیکن محض ذاتی انفرادی واردات انسانی زندگی کا ادھورا وجود پیش کرتی ہیں۔اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے دوسرے معنی خیز پہلوؤں کو بھی ادبی تخلیق کے دائرے میں لایا جائے۔

رخ زمانہ کی ہوا کا کس طرف ہے دیکھنا
ہر روایت توڑنے کی تم نے کیسے ٹھان لی

نہ جاگیں ہم تو مشت خاک جیسی حیثیت اپنی
اگر جاگیں تو پھر اک بوند میں ساتوں سمندر ہیں
اثاثہ آج بھی اپنا ہے اخلاص و وفا انظر
اگر حالات بنجر ہیں تو ہم مثل سمندر ہیں

زندگانی کا تقاضا آدمی عامل رہے
ہو طلاطم بھی مگر نظروں میں اک ساحل رہے

سڑکوں پہ گہری نیند میں ڈوبے ہوئے ہیں لوگ
بے چین ان کے واسطے گھر میں پلنگ ہیں

حسن انظر کے یہاں ادبی نکتۂ نظر سے زندگی کی کلیت عالم گیر جذباتی، نفسیاتی اور فکری لہروں سے منسلک ہو کر ایک ایسا نقش کھینچتی ہے جو جذب اور ربودگی کے دائروں کے باہر جا کر فکری بنیادوں کے ان اہم گوشوں کا سراغ دیتے ہیں جو جدید سائنس کے اس دور میں نئے عہد کی شاعری اور شاعروں کی خصوصیات کو واضح کرتے ہیں۔ نئے شعرا کی اہمیت اور ان سے عام شعرا کا موازنہ کرتے ہوئے میرا جی نے بہت عمدہ بات کہیں ہے:

''آج سائنس کی ایجادوں نے ہر ایک چیز کو دوسری چیز سے قریب کر دیا ہے۔ لیکن انسان انسان سے دور ہو چکا ہے۔ مانا کہ وہ پہلی سی آنکھ اوجھل والی بات اب نہیں رہی۔ لیکن ایک دوسرے کو جاننے کے لیے جس خلوص کی ضرور ہے، سوچ کی جو گہرائی درکار ہے وہ ہر کسی کی طبیعت میں باقی نہیں رہی، یا کم سے کم مٹتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب زندگی سے قریب ہوتے ہوئے بھی اکثر دور ہی رہتا ہے..... نیا شاعر اب ایک ایسے چوک میں کھڑا ہے جس سے دائیں بائیں آگے پیچھے کئی راستے نکلتے ہیں۔ لیکن اسے پوری طرح نہیں معلوم ہے کہ کون سا راستہ اس نے طے کر لیا۔

ماضی کے تجربے کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ کب تک اسے یوں ہی کھڑا رہنا ہے۔ حال کی اضطراری کیفیات کس حد تک اس کا ساتھ دیں گی اور اور کون سے راستے پر اس کو چلنا ہے۔ مستقبل کے خطرات اس کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ نیا شاعر ماحول میں اپنی گہری دلچسپی کا بہانہ کرتا ہے۔ لیکن حقیقتاً وہ صرف اپنی ذات کے ایک دھندلے سے عکس میں محسو ہے۔ اس کے آس پاس اب وہ پرانے سہارے نہیں رہے جن کے بل پر لوگ گھریلو زندگی کے جھمیلے میں سب عمر بسر کر دیتے ہیں۔ وہ اب اکیلا ہے اور اسے سہارے کی جستجو ہے۔''

(نئی شاعری کی بنیادیں، سوغات، جدید نظم نمبر ص ۱۶۳۔۱۶۵)

مسکرانا رائیگاں سی جستجو ہے ان دنوں
منجمد بستی کی رگ رگ میں لہو ہے ان دنوں

گھل مل گئے ہیں عیب و ہنر اپنے وطن میں
حیراں بہت ہیں اہل نظر اپنے شہر میں

شہر میں جا بجا جلتی ہے میری ہی چتا لوگو
مسلسل اک عذاب آگہی ہے، کیا کیا جائے

خانہ بدوش تھا تو بڑا خوش مزاج تھا
گھر کیا اسے ملا تو پریشان ہو گیا

ہے چاندنی میں گناہوں کی اک کشش اپنی
نرالی اور بھی لذت اک اعتراف میں ہے

زندگی کی آگ سے بچ کر کسی بھی آگ میں
کیا عجب جو کود جاؤں بے خطر تیرے لیے

حسن انظر کے اشعار میں عصری شعور کی بنیادوں کے بعض عناصر ان کے تخلیقی شعور کی

ترتیب وتشکیل میں اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔اس طرح ان کے نظام وافکار میں نئے تصورت کے ایسے رنگوں کی آمیزش ہوگئی ہے جو اردو کی شعری روایت میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔

حسن انظر کی شاعری میں اپنے جغرافیائی اور ثقافتی ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے تہذیبی، نفسیاتی اور جذباتی تینوں پہلو میں مماثلتیں تلاش کرلیتا ہے۔ چونکہ زندگی کے یہ تینوں پہلو کسی نہ کسی صورت میں ماضی اور حال کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، اس لیے حسن انظر کی تخلیقات میں بھی قدیم یعنی روایت اور عہد حاضر یعنی جدید دور کو منسلک کر کے ایک مکمل ادبی خاکے کے طور پر برتا گیا ہے۔ یہاں الیٹ کی تحریر کے وہ جملے یاد آتے ہیں جوانہوں نے پونڈ کی نظموں پر دیباچہ لکھتے ہوئے تحریر کیے تھے۔الیٹ نے لکھا ہے:

> ''جدیدیت (جدید دور کی عکاسی) بغیر روایت کے ایک بے معنی لفظ ہے اور کہیں ایسا ادب موجود ہے جو جدید تو ہے لیکن روایت سے اس کا کوئی علاقہ نہیں، تو میں اسے منسوخ کرتا ہوں۔''

حسن انظر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رکے بغیر مریضوں کو دیکھتا ہے وہ
عجب طبیعت ہے، اندر سے مر رہا ہے وہ

اک ایک در پہ صدا اس نے شہر میں دے دی
جو لوگ جاگ گئے سب، تو سو چکا ہے وہ

اگ رہی ہے فصل اک بے چہرگی کی ہر طرف
باعث مشکل بنی ہے اب انا میرے لیے

ذرا سوچو تو کیا ہے زندگانی
ہوائے دوش پر کچا گھڑا ہے

دیر وحرم میں بانٹنا ہی تجھ کو بھول جائے
بندے کی نظروں میں وہ زمان ومکان ہو

حسن انظر نے اپنے اشعار میں شامل تمام جذبات انسانی کو اپنے ذاتی مشاہدے کی کسوٹی

پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں دہرائے ہوئے جذبوں کے ایک مرتبہ پھر دہرائے جانے کا رجحان نہیں ملتا بلکہ انہوں نے انسانی شخصیت کے بدلتے ہوئے رخوں کو اپنی تخلیقی حسیت میں ضم کر کے سماج کے اہم پرتو کی نشاندہی کی ہے۔ تخلیقی اصولوں کی ضرورت کے احساس اور اہمیت کے مدنظر وسیع زاویۂ ادراک ان کی بصیرت کا رشتہ اردو کی تقریباً تمام ذہنی روایت سے جوڑے رکھتا ہے۔ حسن انظر کو اپنے ماحول اور معاشرے کی کھوئی ہوئی اور متواتر گم ہوتی ہوئی قدروں پر حیرت ہے، اس لیے کہ وہ ماحول اور معاشرے جسے انسان کی ابدی تلاش کی تکمیل کی تمثیل کے طور پر جانا اور مانا جاتا تھا۔ بڑے بڑے اولیاء اور رشیوں اور منیوں کی اس سرزمیں پر حالات کی ستم ظریفی نے جہاں اپنی ذات کی تفہیم اور ہم آہنگی کی ازسرنو تجدید کے مواقع گم کردئے وہیں معاشرتی زندگی کا ایک جذباتی نظام جو کسی نہ کسی صورت میں رواں دواں تھا اور اخلاص کے امکانات کو وسیع کرتا تھا، اس کا سراغ بھی اب ناممکن ہوتا جارہا ہے۔

زمانہ بے سبب نا مہرباں ہے
مری غیرت کا یارو امتحاں ہے

بچ کے اپنے خوف سے جانا کہاں
جابجا پاؤ گے سر پر آسماں

ہر جبیں پر آج بھی لکھا ہوا ہے آدمی
پھر بھی لیکن جابجا ہیں ششدرہ حیران لوگ

اپنی بستی میں سبھی بیٹھے ہوئے انظر ملے
معجزوں کے منتظر بے چہرہ بے پہچان لوگ

کوئی کسی کا نہ حال پوچھے، ملے نہ کوئی کسی سے کھل کر
ہر ایک ہارا تھکا لگے ہے، یہ زندگی کیا سزا ہے یارو

فریب و مکر سے سب کچھ اڑا لیا میرا
سکون دل مرا شاطر مگر چرا نہ سکا

حسن انظر کی شاعری میں ذات کے داخل اور خارج ضد کے طور پر نہیں ملتے بلکہ دو سطحوں

کے اتصال کی صورت میں ملتے ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ مکمل طور پر ان کے یہاں تفاوت کے پہلوؤں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔لیکن مماثلت کے پہلو زیادہ حاوی نہیں۔اس طرح ان کا انفرادی تجربے کا اظہار داخلیت پرستی کی ابہام زدگی کے اثرات سے محفوظ ہے۔انہوں نے زندگی کی کلیت کو سمجھنے کے لیے اس کے ظاہر اور باطن دونوں پر یکساں نظر ڈالی ہے۔وہ اسالیب شعر کی جستجو کے مدنظر تسلیم شدہ شعری سانچوں سے الگ کوئی نیا سانچہ تیار نہیں کرتے بلکہ اپنے تجربات و کوائف کے شعری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے زبان کے وسیع تر امکانات تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں۔

پھر جھڑی اشکوں کی انظر ہو نہ جائے رائیگاں
موتیوں کی اس لڑی کو شعر کی گردن میں ڈال

پشیمانی بہت ہے لغزشوں پر بھی ہمیں اپنی
مگر حالات پس منظر کو میں کس کی خطا لکھوں

ہنستے ہنستے دل کی خوشبو لے چلی بادِ صبا
کوچہ و بازار میں پھیلائی رسوائی مری

فن ہی کیا اس شہر میں بکتے ہیں اب فنکار بھی
گھر گیا میں ہائے کن سوداگروں کے درمیاں

ہم اہل دل ہیں عالی حوصلہ ہیں
ابھی نظروں میں گو منزل نہیں ہے

بڑا ہی سخت جاں تھا، وہ بجھا پایا نہ پیاس اپنی
رواں رستے میں اس کے ورنہ تھے گنگ و جمن کیا کیا

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو حسن انظر کی تخلیقات میں وہ شعری قوت موجود ہے جو بہت دیر اور بہت دور تک اپنے اثرات قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔یہ صلاحیت جہاں ان کے روشن مستقبل کی ضامن ہے، وہیں ان کی ادبی تعین قدر کا ایک بہترین وسیلہ بھی۔

نمونۂ کلام

جل رہا ہے آگ میں جنگل کوئی
دیکھتا ہے دور سے بادل کوئی

گولیوں کی بے سب بوچھار میں
گھر گیا بے آسرا پاگل کوئی

پوچھ کر ان کا پتہ بازار میں
میرے غم کو کر گیا بوجھل کوئی

پاسبان اپنا ہمالہ ہے اگر
کیا ڈرائے خوف کا دلدل کوئی

ہر جگہ بسنے لگا ہے آدمی
کیا بچے گا ساگواں صندل کوئی

کیا کوئی سقراط پھر مارا گیا
آج پھر بستی میں ہے ہلچل کوئی

فون پھر اس خوش نوا کا آئے گا
سوچ میں بجتی ہے جو پائل کوئی

زندگانی کا تقاضا آدمی عامل رہے
ہو طلاطم بھی مگر نظروں میں اک ساحل رہے
میرے مولا منقسم ہونے سے اب مجھ کو بچا
ہر دعا میں پھر مری انسانیت شامل رہے
یہ عجب انداز کیسا ہے مقدر کا مرے
ابر کی دریا دلی میں کیوں ہوا حائل رہے
ڈھونڈ کر سورج زمانے کو کبھی دکھلائے گا
دھند میں کتنا چھپا چاہے کوئی قاتل رہے
سب سے افضل کیسے مخلوقات میں کہلاؤ گے
خود پسندی خود پرستی کے اگر قائل رہے
گیت عظمت کے تری اے زندگی گاتا رہوں
رہنما یوں ہی سدا اپنا مہہ کامل رہے
فخر اپنی سرفرازی پر رہا ہر دم انہیں
پیار کی دہلیز پر انظر مگر سائل رہے

بچ کے اپنے خوف سے جانا کہاں
جا بجا پاؤ گے سر پر آسماں
سلطنت اس کی ہے سچ مچ بے کراں
دیکھنے میں بس زمین و آسمان
ہو تصور میں دھنک صورت تمہیں
دل نشینی تجھ سے مانگے ہے زبان
ساتھ جو تیرا نہیں تو زندگی
راہرو گم گشتۂ و بے خانماں
کوئی نیزے پر تو کوئی دار پر
فصل ہے تازہ سروں کی پھر یہاں
شادماں خوابوں کی بستی ہے تری
ہم کو بھی انظر حسن لے چل وہاں

وہ دوست بن کے مجھے آئینہ دکھا نہ سکا
ردا فریب کی رخ سے کبھی ہٹا نہ سکا

امیر شہر کا مانا کہ دبدبہ ہے بہت
ترے فقیر کا لیکن وہ سر جھکا نہ سکا

ہزار اپنے تھے دشمن یہاں وہاں لیکن
ہماری نظروں سے کوئی ہمیں گرا نہ سکا

فریب و مکر سے سب کچھ اڑا لیا میرا
سکون دل میرا شاطر مگر چرا نہ سکا

ہمیں بھی ناز ہے انظر کی سخت جانی پر
شب سیاہ کا دریا اسے بہا نہ سکا

جاتے جاتے پھر انوکھی سی کسی الجھن میں ڈال
ہنستے ہنستے زہر غم ہر سانس ہر دھڑکن میں ڈال

جس طرف بھی دیکھ لوں آئے نظر جلوہ تیرا
اک دھنک اشکوں میں بھر دے نغمگی ساون میں ڈال

کھو نہ جاؤں پھر اندھیروں میں کہیں اے چاند میں
نور کا ساماں ذرا کھل کر میرے دامن میں ڈال

مدتوں سے یہ گدائے دل ترے کوچے میں ہے
اور کچھ لمحات کی سوغات اس برتن میں ڈال

جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک دے
کچھ انوکھا اب کے میری سوچ کے آنگن میں ڈال

آئے ہونٹوں تک کوئی احساس کی تازہ لہر
اک جھلک ایسی بھی اب دنیائے فکر وفن میں ڈال

جاوداں اے کاش یہ وقت وداع یار ہو
نور و نکہت کی پھواریں جان جاں تن من میں ڈال

پھر جھڑی اشکوں کی انظر ہو نہ جائے رائیگاں
موتیوں کی اس لڑکی کو شعر کی گردن میں ڈال

تو کہ تھا سیار ساکن منظروں کے درمیاں
جانے کب ٹوٹا گرا جادوگروں کے درمیاں

اب تو ہم تم ہی نہیں صناع بھی ہے مضمحل
اپنے ہاتھوں کے تراشے پیکروں کے درمیاں

فن ہی کیا اس شہر میں بکتے ہیں اب فنکار بھی
گھر گیا میں ہائے کن سوداگروں کے درمیاں

اب تو مجھ کو ڈر نہیں ہے سنگباری کا کوئی
ہو چکا ہوں میں بھی پتھر پتھروں کے درمیاں

فکر کو جذبے سے ملنے دیجیے انظر حسن
ہو غزل میٹھی مگر دانشوروں کے درمیاں

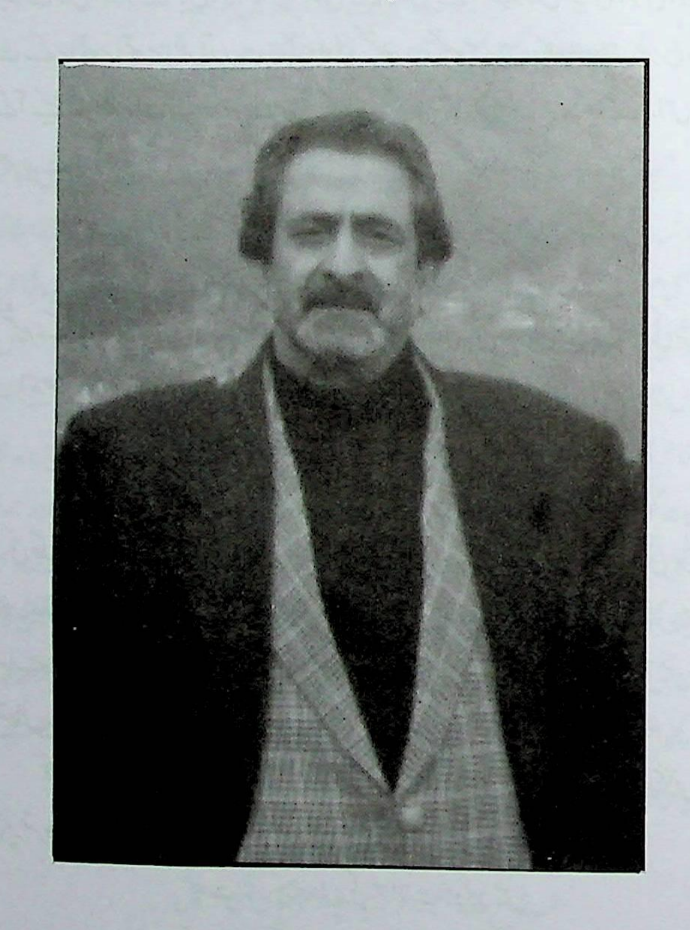
سہے ہیں اے محبت کے خدا رنج و محن کیا کیا
تمناؤں نے محرومی کے اوڑھے ہیں کفن کیا کیا
بڑا ہی سخت جاں تھا وہ بجھا پایا نہ پیاس اپنی
رواں رستے میں اس کے ورنہ تھے گنگ و جمن کیا کیا
قریب آ کر نہ یوں ہنستے ہوئے پھولوں میں جھانکا کر
خدا جانے نہاں ہو زیرِ رنگیں پیرہن کیا کیا
قفس نے کر دیا بے بال و پر مجھ کو مگر پھر بھی
تیرے ہی گیت گاؤں عادتاً میرے چمن کیا کیا
ازل سے ہی زمانہ عشق کو مجرم سمجھتا ہے
نجانے پیش اب آئے سوا دار و رسن کیا کیا
وفا پاکیزگی عصمت سبھی بازار میں دیکھے
ترے چہرے پہ باقی داغ ہیں میرے وطن کیا کیا
تیرے نالے تیری فریاد بھی فرحت بخشتے ہیں
تجھے زخم جگر آتے ہیں اندازِ سخن کیا کیا
جگر زخمی نگہ پر نم لبوں پر نغمۂ غم ہے
تیرے احسان بھی انظر پہ ہیں تو بہ شکن کیا کیا

وہ یوں مجھ کو آزمائش میں ڈالتا ہے
میں ڈگمگانے لگوں تو آکر سنبھالتا ہے
جو خوف بھی نادیدہ ڈبوتا ہے بحرِ غم میں
خیال ان کے کرم کا باہر نکالتا ہے
زمانہ جھکتا اگر ہے تو عاشقوں کے آگے
شہنشہوں کے بھی تاج ورنہ اچھالتا ہے
کہیں بھی برپا ہو ظلم اور استبداد چاہے
ضمیر والوں کے تن بدن کو ابالتا ہے
بڑا مجاہد حیات کی رزم گاہ میں جو
کما کے رزقِ حلال بچوں کو پالتا ہے
جو بھول پائے نہ رنگ و بو کے جہاں میں تجھ کو
بھنور سے کشتی وجود کی وہ نکالتا ہے
خدا کی مخلوق سے محبت کرے جو انظر
زمانہ خود کو اسی کی مرضی میں ڈھالتا ہے

مسکرانا رائیگاں سی جستجو ہے ان دنوں
منجمد بستی کی رگ رگ میں لہو ہے ان دنوں
جسم و جاں قلب و نظر مانگے رفو ہے ان دنوں
گرچہ روشن حکم حق لا تقنطو ہے ان دنوں
ہر کسی کی اک الگ دنیا جزیرے کی طرح
ہر کوئی بس خود سے محو گفتگو ہے ان دنوں
خواب ٹوٹے پھول پھل امید کے سب بجھ گئے
بے نوا گلشن میں مرغ خوش گلو ہے ان دنوں
تیرگی میں اک ذرا آہٹ پیام موت ہے
دوسرا کیا اپنا سایہ بھی عدو ہے ان دنوں
سخت جان انظر حسن تیرا بھی نالہ زن ہوا
بارش گریہ سے وہ بھی باوضو ہے ان دنوں

گھل مل گئے ہیں عیب و ہنر اپنے وطن میں
حیراں بہت ہیں اہل نظر اپنے وطن میں
بیگانہ یہاں ہر کوئی اک دوسرے سے ہے
ہر پیڑ مانگے برگ و ثمر اپنے وطن میں
ہر پل نیا فتنہ، نیا کہرام جنم لے
ہر لحظہ نیا رقص شرر اپنے وطن میں
آسیب کا گھر گھر پہ سایہ اور ہر شہری
خاموش و ساکت ہدف قہر اپنے وطن میں
امید بیعت جن سے تھی احباب وہ سارے
تانے ہوئے ہیں تیر و تبر اپنے وطن میں
خوش بخت ہیں جو شام کو لوٹ آئے سلامت
بارود سے بچتے ہوئے گھر اپنے وطن میں
کب تیرگی کے دیو کی پسپائی ہم دیکھیں
کب روشنی آئے گی نظر اپنے وطن میں

سجاد حسین



سجاد حسین کی تخلیقی حسیت

سجاد حسین بحیثیت کشمیری شاعر وادی کے تہذیب وتمدن اور اس کی خوبصورتی کے جو نقش اپنی تخلیقات میں ابھارتے ہیں، وہ قابل تحسین ہے۔ ان کے اشعار میں سیاسی، قومی، وطنی اور ملی خیالات کے ساتھ ساتھ مناظر قدرت جو کہ وادیٔ کشمیر سے مخصوص ہیں، کا بیان اس طرح ملتا ہے کہ اس کے آئینے میں قدرت کے دوسرے مناظر کا بیان بھی استعاراتی طور پر ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک شعر یہ ہے۔

اسلام سایہ دار تناور چنار ہے
جس کو حسین پیاسے نے خون جگر دیا

وادیٔ کشمیر کے شعرا کے علاوہ یا وادیٔ کشمیر کے بیش تر شعرا کے یہاں اور ان کے علاوہ کوئی شاعر اگر یہ مضمون باندھتا تو غالب امکان ہے کہ شعر یوں ہوتا۔

اسلام سایہ دار تناور 'درخت' ہے
جس کو حسین پیاسے نے خون جگر دیا

درخت کی جگہ 'چنار' کے استعمال سے معنوی وسعت میں ممکن ہے کچھ حد تک کمی واقع ہوتی ہو لیکن ایک نیا پن جو پیدا ہوا ہے، اس نے تاثر میں شدید اضافہ کیا ہے۔ اور شاعر کے اپنی مٹی سے شدید محبت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ 'درخت' کے استعمال میں جو معنوی تہیں ہیں، اس کو سجاد حسین نے 'چنار' کے استعمال سے ابھارنے کی کوششیں کی ہیں۔

اس طرح کی چھوٹی بڑی کوشش سجاد حسین کی شاعری میں اگر کثرت سے نہیں تو بعض جگہوں پر ضرور ملتی ہیں۔ نعت کے یہ اشعار دیکھے جائیں۔

چھت نار چناروں کی حرارت ہو لہو میں
پھر صورت شمع مرے افکار ہوں آقا ﷺ
لوٹا دے لٹے گھر کی مرے عظمت رفتہ
مینار منور مری اقدار ہوں آقا ﷺ

تاباں و سلامت رہے دستار کی حرمت

قربان اگر سر ہوں، تو سو بار ہوں آقا ﷺ

اسی طرح امام حسین رضی اللہ عنہ کی مدح میں 'نذرانۂ عقیدت' کے عنوان سے تخلیق کیے گئے اشعار میں سے دوشعر ذیل میں درج ہیں:

کیا کہنے ایسے شوق شجاعت کے صبر کے

گھر دے کے اس نے راہ محبت میں سر دیا

کیسی تھی وہ فراط کہ پانی کے گھونٹ سے

مہمانی کر سکی نہ کسی تشنہ کام کی

'سماجی انتشار اور قوم وملت کا درد' یہ اور اس قسم کے کئی موضوعات آج کے عہد کی شاعری کا ناگزیر حصہ بن چکے ہیں۔ ان کا بیان سجاد حسین کے یہاں بھی موجود ہے۔ لیکن ان میں نئے مطالبات کی جھلک بھی موجود ہے۔ وہ نئے شعور اور اس کے تقاضوں سے بے بہرہ نہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ ان کی دیگر مصروفیات کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے طرحی غزلوں میں طبع آزمائی ردیف وقافیہ، عروض و بیان، صنائع بدائع، محاورہ بندی وغیرہ کے کرتب کو ہی اصل شاعری کا منصب قرار نہیں دیا ہے بلکہ ان سے بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی خالص اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مجموعی احساسات کے ساتھ ساتھ انفرادی احساسات اور جمالیاتی جذبات کو بھی شعروادب کا حصہ بناتے ہیں۔ اس سلسلے میں کشمیر کی خوبصورتی کو تخلیقی سطح پر برت کر وطن کا ایک فریضہ بھی ادا کیا ہے۔ اہل کشمیر کے لیے اور مناظر قدرت سے دلچسپی رکھنے والے تخلیق کاروں کے لیے کشمیر کی خوبصورتی کا بیان کوئی نئی بات نہیں ہے۔ لیکن خالص تخلیقی شعرا کے یہاں اظہار بیان کی کچھ نہ کچھ انفرادیت ضرور موجود ہے۔ سجاد حسین کا بھی اپنا طرز اظہار ہے۔ دلیل کے لیے ایک غزل کے پانچ اشعار ذیل میں درج ہیں۔

آبشاروں، جھیل جھرنوں، کوہساروں کی زمیں

اے مرے کشمیر، تو ہے چاند تاروں کی زمیں

جاں فزا تیری ہوائیں، تیری ندیاں سلسبیل

مثل جنت رشک دنیا ماہ پاروں کی زمیں

ہم نوا، ہم دوش، ہم سر آسماں تیرے چنار

سر فلک شمشاد، سرکش دیوداروں کی زمیں

چومتا ہے آسماں تیرا بدن تیری جبیں
سرفروشوں، دردمندوں، جاں نثاروں کی زمیں
آبرو ہے، جستجو ہے، تو ہماری آن ہے
جاں فدا سو بار تجھ پر اے نظاروں کی زمیں

سجاد حسین کی فکری توسیع میں سیاست اور مذہب کے نام پر غلط کاریوں کے عمیق مشاہدوں کا بھی بڑا دخل ہے۔ یہ غلط کاریاں اپنی ترقی یافتہ شکل میں تہذیبی انتشار کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جو مختلف قسم کی پیچیدگیوں کو راہ دیتی ہیں۔ یہ پیچیدگیاں زندگی کے واضح شعور پر ادراک کی روشنی کی راہ میں حائل رخنوں کو دور کرنے کی ضمن میں اہم کردار ادا کرتی ہیں یا معاملات کو مزید پیچیدہ بنا دیتی ہیں۔ وادیٔ کشمیر میں چرار شریف کا خوں ریز واقعہ جن میں چرار شریف آتش زدگی کا شکار ہو گیا تھا۔ اتفاق سے سجاد حسین اس وقت چرار شریف کے قرب میں موجود تھے۔ اس واقعے کا جو اثر ان کے تخلیقی ذہن پر ہوا، اس کو انھوں نے غزل کے اشعار میں سمو دیا ہے۔ اس میں تہذیبی انتشار کی وہ صورت نمایاں ہے جو اچھائی برائی، سچ جھوٹ کے خلط ملط ہو جانے سے وجود میں آتا ہے۔ چرار شریف کے تعلق سے ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

نظر میں خواب چناروں کی سرخیاں ہوں گی
کہاں وہ شہر کہاں اب وہ بستیاں ہوں گی
تھکن سے چور جو لوٹیں گی پھر ابابیلیں
جلے مکاں میں کہیں چھت نہ کھڑکیاں ہوں گی
وہ جن کے غیض وغضب سے مکین سہمے ہیں
مرے ہی گھر میں گرجتی وہ بجلیاں ہوں گی
یہ معرکہ بھی ابھی اپنے نام لکھ دو تم
خبر خبر میں یہی اب کے سرخیاں ہوں گی
اگر حساب میں چھوٹے بڑے گناہ ہوں گے
وہیں کہیں مری دو چار نیکیاں ہوں گی

سجاد حسین نے اپنے مطالعہ وفکر اور ذہنی تربیت کے اعتبار سے اپنے معاشرے کی زندگی کو دیکھنے، برتنے اور سمجھنے کے لیے جس شعوری طرز احساس کی پرورش کی ہے، وہ نئی نفسیات کے اظہار کے لیے رموز وعلائم کا سہارا بھی لیتی ہے۔ ان کے یہاں زندگی کا ایک مثالی اور عینی تصوراتی اقدار کا

حامل بنا بنایا نظام نہیں ہے بلکہ نیکی و بدی، محبت ونفرت، وفا اور جفا، سکون و اضطراب اور جنون و آ گہی وغیرہ کی بدلتی تصویروں اور صورتوں میں تہذیبی قدریں بھی الگ الگ خانوں سے وابستہ ہیں اور تغیر و تبدل کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس لیے زندگی کے کسی ایک تصور کو قبولیت کے جذبے سے سرفراز کر دینا قدر دشوار ہے۔ سجاد حسین نے اس کے ارتقاع اور اس کے مثبت اور تخلیقی پہلوؤں اور ان کی مدد سے تہذیبی قوتوں کے نشو و نما کی جانب بھی اپنی کوششوں کو جاری رکھا ہے۔ یہ کوششیں براہ راست نہیں ہیں بلکہ نیم طنزیہ اور کبھی مایوس طرز اظہار کو کام میں لایا گیا ہے۔

بے کرانی میں ہم بکھر جائیں
پا بہ صحرا ہیں اب کدھر جائیں
ناتوانی سی ناتوانی ہے
سانس بھی لیں اگر تو مر جائیں
کوئی آسیب ہے چناروں میں
پھول مہکیں اگر تو ڈر جائیں
کھول دو بادبان کشتی کے
ہاتھ دو دو بھنور سے کر جائیں
منھ اندھیرے نکل گیا رہبر
رات سر پر ہے اب کدھر جائیں

سجاد حسین کے یہاں نئے انسان کی ذات اور کائنات سے وابستہ بیش تر سوالوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ سماجی وجود میں معنی کی جستجو اور کائنات کو اپنی معاشرتی زندگی سے معمور دیکھنے کی خواہش انہیں ہمہ وقت اضطراب میں مبتلا رکھتی ہے۔ ان کا شعور آفاق گیر حقیقتوں سے مربوط ہونے کے لیے انسان کی ذات کے پر پیچ ابعاد سے بھی جد و جہد کرتا ہے جو رنگ و نسل اور قوم و مذہب کے اختلاف کی عطا کردہ ہیں۔ اس سے جہاں عصری تہذیب متاثر ہوتی ہے وہیں جذبہ و ہوش کی گمرہی اور اس کے نتیجے میں نامساعد حالات جو نئے انسان کو غم آلود آرزومندی کا عکس محض بنا دیتے ہیں۔ سجاد حسین برہمی اور احتجاج کی اس فضا میں مختلف النوع رنگوں اور متضاد حقیقتوں کی اجتماعیت میں فکری وسعت کے متمنی نظر آتے ہیں۔ وہ فکری وسعت جو ان کے اشعار کے چھوٹے بڑے موضوعات کی ترسیل میں کارآمد ہو۔

کتنے سارے سوال کرتے ہیں
لوگ بھی بس کمال کرتے ہیں

ٹوٹی کشتی ہے تیز دھارا ہے
حوصلہ ہے تو بس ہمارا ہے
بے سبب قافلے نہیں رکتے
آج گردش میں پھر ستارا ہے
تم اسے بھی کہیں ڈبو دو گے
میری پہچان یہ شکارا ہے

خوابوں کی سوغات لکھوں
صحرا میں برسات لکھوں

سجاد حسین نے زبان اور لہجے کی بنیاد کے سلسلے میں بعض ایسے آہنگ منتخب کیے ہیں جو بالکل نئے اور اجنبی نہیں ہیں بلکہ ہماری تربیت یافتہ غزل کے ہی ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں۔ اور موسیقی کے لیے بھی بہت کار آمد ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں نئی نئی ردیفیں نکالنا یا لمبی لمبی غزلیں کہنے کا شیوہ ان میں نہیں ہے۔ یہ لہجہ عہد حاضر کے مزاج اور جدید نفسیات کی آئینہ داری اس طور کرتا ہے کہ جدید ذہن کی کارفرمائی کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ عہد حاضر کی مختلف کیفیتوں کو احاطۂ فکر میں لانے کے لیے جن تخلیقی حسیات کی ضرورت ہوتی ہے وہ سجاد حسین کے اشعار میں بہت حد تک نظر آتی ہیں۔ ہماری تربیت یافتہ غزل جس کا ذکر میں نے کیا ہے اور جو موسیقی کے لیے بھی کار آمد ہے، کے سلسلے میں دلیل کے طور پر سجاد حسین کے یہ اشعار درج ہیں:

ایک پل کی ہی سہی یاد اگر رہتی ہے
آگ سینے میں لگی آٹھ پہر رہتی ہے
آدمی دھول، دھوئیں، دھند میں کھو جاتا ہے
نقش پا رہتے ہیں، منزل نہ ڈگر رہتی ہے
دور تک راہ میں قدموں کے نشاں رہتے ہیں
سنگ میلوں کو مسافر کی خبر رہتی ہے

پھر سے دہکاتی ہے شعلوں کو ہوا دیتی ہے
راکھ کے ڈھیر میں تاثیر شرر رہتی ہے

سجاد حسین کا تخلیقی سفر ابھی جاری ہے۔ حالانکہ تخلیق کے معاملے میں ان کی رفتار کچھ زیادہ تیز نہیں ہے۔ لیکن ان کی جو بھی تخلیقات منظر عام پر آئی ہیں، ان کے معیار پر غور کرتے ہوئے انہیں ایک بہتر تخلیق کار تسلیم کرنے میں کوئی دشوار نہیں۔

نمونۂ کلام

اک نظر عنایت کا طلبگار ہوں آقا
گردش میں زمانے کی گرفتار ہوں آقا
منظر میری جھیلوں کے وہ ندیوں کی روانی
عالم میں بیاں زیب یہ کوہسار ہوں آقا
چھت نار چناروں کی حرارت ہو لہو میں
پھر صورت شمع میرے افکار ہوں آقا
دہرائے گی تاریخ اگر میرے ترانے
مہتاب ستاروں میں وہ ہر بار ہوں آقا
لوٹا دے لٹے گھر کی میرے عظمت رفتہ
مینار منور مری اقدار ہوں آقا
تاباں و سلامت رہے دستار کی حرمت
قربان اگر سر ہوں، تو سو بار ہوں آقا

قربانی حسین نے ایسا اثر دیا
اک عزم حوصلہ میری رگ رگ میں بھر دیا
کیا کہنے ایسے شوق شجاعت کے صبر کے
گھر دے کے اس نے راہ محبت میں سر دیا
سو بار سر گرے نہ گرے تاج منزلت
ہاں وارث رسول نے ایسا ہنر دیا
اسلام سایہ دار تناور چنار ہے
جس کو حسین پیاسے نے خون جگر دیا
راہ خدا میں چمکا جو نقش حسینیت
ہر کارواں کو اس نے شعور سفر دیا
بس دامن سخی میں تھی یہ نذر آخری
اصغر سا چھ مہینے کا لخت جگر دیا
وہ نور حق جو پہنچا ندی سے امام تک
سجاد شب کو اس نے مزاج سحر دیا

گردش میں نام پاک رہا صبح و شام کی
ہر دور میں عظیم ہے عظمت امام کی

رکھتا نہیں ہوں جب کہ میں جرأت سلام کی
میں کون ہوں کہ مدح کہوں گا امام کی

منظر حسین بھی ہے مگر دردناک ہے
خون حسین نکھرا ہے سرخی میں شام کی

کیسی تھی وہ فراط کہ پانی کے گھونٹ سے
مہمانی کر سکی نہ کسی تشنہ کام کی

دل غمزدہ ہے اور بدن زخم زخم ہے
تصویر یہ ہے سرور عالی مقام کی

کوفے میں اور کوچہ و بازار شام میں
در در پھری ہے آل رسول امام کی

سجاد سر بہ خم ہے بہت احترام سے
سرکار میں امام علیہ السلام کی

ایک پل کی ہی سہی یاد اگر رہتی ہے
آگ سینے میں لگی آٹھ پہر رہتی ہے
بوند بھر پیاس سمندر کی طلب ہوتی ہے
پا بہ صحرا کی سرابوں پہ نظر رہتی ہے
آدمی دھول، دھوئیں، دھند میں کھو جاتا ہے
نقش پا رہتے ہیں، منزل نہ ڈگر رہتی ہے
دور تک راہ میں قدموں کے نشاں رہتے ہیں
سنگ میلوں کو مسافر کی خبر رہتی ہے
پھر سے دہکاتی ہے شعلوں کو ہوا دیتی ہے
راکھ کے ڈھیر میں تاثیر شرر رہتی ہے

آبشاروں جھیل جھرنوں کوہساروں کی زمیں
اے میرے کشمیر تو ہے چاند تاروں کی زمیں
جاں فزا تیری ہوائیں تیری ندیاں سلسبیل
مثل جنت رشک دنیا مہ پاروں کی زمیں
ہم نوا ہم دوش ہم سر آسماں تیرے چنار
سر فلک شمشاد سرکش دیوداروں کی زمیں
چومتا ہے آسماں تیرا بدن تیری جبیں
سرفروشوں دردمندوں جاں نثاروں کی زمیں
آبرو ہے، جستجو ہے، تو ہماری آن ہے
جاں فدا سو بار تجھ پر اے نظاروں کی زمیں

خوابوں کی سوغات لکھوں
صحرا میں برسات لکھوں
دیپ پتنگا درد جنوں
لمبی ہجر کی رات لکھو
بستی کے چوراہے پر!!
اپنے دل کی بات لکھوں
بھیگی ریت پہ ساحل کی
یادوں کی بارات لکھوں
عشق محبت اپنا پن
ایک پرانی بات لکھوں
نام تمہارے اپنے سب
شام سحر دن رات لکھوں

نظر میں خواب چناروں کی سرخیاں ہوں گی
کہاں وہ شہر کہاں اب وہ بستیاں ہوں گی
تھکن سے چور جو لوٹیں گی پھر ابابیلیں
جلے مکاں میں کہیں چھت نہ کھڑکیاں ہوں گی
کنول گلاب کھلیں گے نہ گلستاں ہوں گے
اداس اب کے بہاروں میں تتلیاں ہوں گی
وہ جن کے غیض وغضب سے مکین سہمے ہیں
میرے ہی گھر پہ گرجتی وہ بجلیاں ہوں گی
سفر سے پہلے ہی تم کو میں باخبر کردوں
ہوائے تند مخالف میں کشتیاں ہوں گی
یہ معرکہ بھی ابھی اپنے نام لکھ دو تم
خبر خبر میں یہی اب کے سرخیاں ہوں گی
اگر حساب میں چھوٹے بڑے گناہ ہوں گے
وہیں کہیں میری دوچار نیکیاں ہوں گی
حسین چھوڑ کے یہ شہر ہم کہاں جائیں
کہاں چنار یہ جھرنے یہ وادیاں ہوں گی

بے کرانی میں ہم بکھر جائیں
پا بہ صحرا ہیں اب کدھر جائیں
یہ صدا آشنا سی لگتی ہے
لوٹ آؤ میاں کہ گھر جائیں
ناتوانی سی ناتوانی ہے
سانس بھی لیں اگر تو مر جائیں
کون پہچانتا ہے چہروں کو
روشنی میں ذرا ٹھہر جائیں
کوئی آسیب ہے چناروں میں
پھول مہکیں اگر تو ڈر جائیں
کھول دو بادبان کشتی کے
ہاتھ دو دو بھنور سے کر جائیں
آپ مہتاب ہیں ستاروں میں
ہم کہ رقص شرر سے ڈر جائیں
منہ اندھیرے نکل گیا رہبر
رات سر پر ہے اب کدھر جائیں

کتنے سارے سوال کرتے ہیں
لوگ بھی بس کمال کرتے ہیں
ایک لمحہ بھی اک اذیت ہے
ہم بسر ماہ و سال کرتے ہیں
پھول خوشبو کی بات ہوتی ہے
آپ کو ہم مثال کرتے ہیں
صورت شمع صبح تک جل کر
ہجر کو اب وصال کرتے ہیں
وہ ندی کوہ کن کہانی ہے
آؤ کچھ لا مثال کرتے ہیں
تم سخن ساز ہو اگر ہم بھی
گاہے کار محال کرتے ہیں

ٹوٹی کشتی ہے تیز دھارا ہے
حوصلہ ہے تو بس ہمارا ہے
خیمہ زن وادیوں میں لشکر ہے
کس کے نرغے میں گھر ہمارا ہے
بے سبب قافلے نہیں رکتے
آج گردش میں پھر ستارا ہے
تم اسے بھی کہیں ڈبو دو گے
میری پہچان یہ شکارا ہے
ہم کو ساحل کی کب تمنا تھی
ہاتھ دو ہاتھ پر کنارا ہے
دو بدو ہو کے آزماتے ہیں
تیر تیرے جگر ہمارا ہے
فیصلہ بھی تمہیں سنا دو اب
کون جیتا ہے کون ہارا ہے
تم سے منسوب ہم سراپا ہیں
اب اگر ہے تو کیا ہمارا ہے
وقت منصور کر گیا ہم کو
بر سر دار سر ہمارا ہے

نسرین نقاش



نسرین نقاش کا فن۔غزل اور نظم میں

سیدہ نسرین نقاش نے اپنی شاعری میں تبدیلیٔ خیالات کے جتنے مراحل طے کیے ہیں، ان کو محسوس کرتے ہوئے ایک استعجابی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایسا علم ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی شعور کسی ایک رخ پر سفر نہیں کرتا۔ اور اگر کرتا بھی ہے تو اس میں کہیں ٹھہراؤ کی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ نسرین نقاش کے یہاں مشاہدات اور تجربات کو جلد از جلد تخلیقی جامہ پہنانے کا رجحان ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تخلیقی جست کبھی کامیاب بھی ہوتی ہے اور کبھی ٹھوکر بھی کھاتی ہے۔

فنا کے تیر ہوا کے پروں میں رکھے ہیں
کہ ہم گھروں کی جگہ مقبروں میں رکھے ہیں
اۓ زندگی نہ گذرنا ہماری گلیوں سے
ابھی ہمارے جنازے گھروں میں رکھے ہیں
ہمارے سر پہ حقائق کی دھوپ ہے نسرین
حسین خواب تو بس چادروں میں رکھے ہیں

کچھ اس طریقے سے بدلا ہمارے گھر کا مزاج
ہمارے سر سے بزرگوں کی شفقتیں بھی گئیں

زندگی اپنی کہاں ہے نسرین
ہم تو بس سانس لیا کرتے ہیں

نسرین نقاش کا عام دکھ وہی ہے جو دیگر نسوانی کردار کا ہوتا ہے۔ لیکن اس میں انھوں نے ماحول، حالات اور منظر جو کہ دنیا اور بالخصوص وادیٔ کشمیر سے متعلق ہیں، کو اولیت کا درجہ دیتے ہوئے نسوانی مسائل کو ثانوی حیثیت دی ہے۔ حالانکہ زندگی میں اجتماعیت سے زیادہ فردیت کی اہمیت مسلم

ہے۔لیکن نسرین نقاش غم دوراں میں غم جاناں کے کرب کو منتقل کر کے یا تو اس کرب کو زیریں سطح تک لے جانا چاہتی ہیں یا پھر اسے دفن کر دینا چاہتی ہیں اور اس میں زیادہ وہ کامیاب بھی رہی ہیں لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود جہاں جہاں ان کی تخلیقات میں نسوانیت کے کرب نے سر ابھارا ہے، اس میں اس قدر شدت آگئی ہے کہ ماحول، حالات اور منظر علامتی اور استعاراتی طور پر اس دکھ درد اور کرب کے ترجمان بن گئے ہیں۔

میں نے کیا جرم کیا ہے یہ بتائے کوئی
گھر جلے میرا، کہیں آگ لگائے کوئی

ہم اس مکاں سے بہت دور آگئے لیکن
عجیب آہٹیں دیوار و در میں چھوڑ چلے

صحرا دکھائی دے نہ سمندر دکھائی دے
اب تک وہی بچھڑنے کا منظر دکھائی دے

مئے، خوشی، آنسو، لہو سب پی گئے
زندگی ہم ہیں وہی رندوں کے رند

وہ میری جان کا دشمن ہے اور دل میں ہے
کہ جیسے زہر میں آب حیات شامل ہے

پہلا شعر باؔنی کے ایک شعر کے دوسرے مصرعہ

ع   آگ کہیں ہو، یہاں ہو جلنے والا میں

کا ترجمان ہے۔ ممکن ہے باؔنی کے مطالعے کا اثر نسرین نقاش کے لاشعور میں محفوظ ہو۔اس شعر کا دوسرا معنی جو پوری نسوانی کائنات کے حوالے سے آفاقی سچائی بن کر ہمارے سامنے آتا ہے، یہ کہ آدم کے بیٹے ملک کی فوج سے دوسرے ملک کی فوج کی صورت میں یا ایک قوم کے سپاہی دوسرے قوم کے سپاہی سے یا ایک آدمی جب دوسرے آدمی سے جنگ و جدال کا ارتکاب کرتا ہے تو بنا کسی قصور کے سب سے زیادہ متاثر ہونے والی ذات محض رشتوں کے انسلاک کے جرمانے کے طور پر حوا کی بیٹیوں

کی ہی ہوتی ہے۔

نسرین نقاش کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک سوال جو ذہن میں ابھرتا ہے، وہ یہ کہ کیا فطرت کے تقاضوں پر جبراً اختیار حاصل کر کے زندگی کرنا اسی طرح ممکن ہے جس طرح ایک عام زندگی؟ کیونکہ عام زندگی میں بھی ہم اکثر و بیشتر چھوٹے بڑے موقعوں پر اسی طرح کے عمل انجام دیتے رہتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ہم پوری دنیا کا نظارہ کریں تو فطری تقاضے احساسات کی صورت میں اپنی جبراً اختیاری کو دوسری حسیاتی ذرائع کے توسط سے توڑتے ہوئے فنون کے ایک یا ایک سے زائد یا تمام فنون کی شکل میں تبدیل ہو کر ذات اور کائنات کے درمیان کے اس خلا کی ترجمانی کرتے رہتے ہیں۔

اس لیے خوش ہیں کہ بیداری کا پتھر مار کر
ہم نے سوئے منظروں کو شور محشر کر دیا

رہ حیات میں توقیر آگہی کیا ہے
سراغ زیست اگر دشت گمرہی سے ملے

وفا کے تپتے صحرا سے کسی کو
جو مل جائے تو اک قطرہ بہت ہے

حرف و معنی کی جستجو ہے اگر
دل کی سادہ کتاب لیتا آ

نسرین نقاش نے خیالات کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ ابلاغ کی ترسیل کا مسئلہ پیدا نہ ہونے پائے بلکہ الفاظ کے انسلاک کے بعد مفہوم و معنی کی بنیادوں پر اشعار شعری زبان کا تحفظ اس طور کریں کہ خیالات الفاظ کی حد میں مقید ہونے کے باوجود بدلتے سیاق و سباق، زبان و مکاں اور حالات و مظاہر کے ساتھ نئے نئے معنی سے ہم کنار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جمالیاتی وحدت بھی تخلیق کر سکیں۔ ان کی شاعری میں خیال پرستی اور خیال بندی کی اہمیت ثانوی ہے اور شعری تجربات اور اس کے اظہار کی نوعیت اول۔ اپنے زمانے اور اپنے ماحول کے تناظر میں شعری فکر کو بروئے کار لا کر جبر کے مختلف پہلوؤں اور جدید شعور سے منسلک ہو جانے کے سبب اس

کے مزید نقائض کو نسرین نقاش نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔

فاقہ کش، مدقوق، نیم عریاں بدن
یہ بھی ہیں تہذیب کے شہکار دیکھ

دھواں دھواں سا وہ منظر ہمارے ساتھ رہا
تمام عمر جلا گھر ہمارے ساتھ رہا

دل کا رشتہ مستقل غم بن گیا
دوستی سے دشمنی الجھی رہی

مسخ چہروں کی نمائش گاہ میں
سج گئے ہیں وقت کے شہکار لوگ

نسرین نقاش نے سماجی، مادی اور تاریخی تصورات کے پس منظر میں جدید ذہنی روایت کے رجحان کو فلسفہ اور ادبی مفاہیم کے امتیازات سے جوڑتے ہوئے جذبہ وخیال کی آویزشوں اور پیکار کو سمجھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انھیں اس کا پورا احساس ہے کہ آج کا تہذیبی نشاۃ الثانیہ علوم وافکار کے شعبوں کو جن تبدیلیوں سے دوچار کر رہا ہے وہ اب روایت سے بغاوت کی صورت سے بالاتر ہو کر زمانے کے فطری تسلسل اور خودکار عملیات کے لازمی عناصر کے طور پر اپنی جڑیں جما چکا ہے۔ اپنے عہد کے اس قسم کے قوی الاثر مقاصد سے شعوری طور پر نبرد آزمائی تو بہت مشکل امر ہے۔ تاہم اس کا اظہار بھی اپنی جگہ ایک اہمیت رکھتا ہے۔ نسرین نقاش کے یہاں یہ اظہار مختلف تخلیقی صورتوں میں ظاہر ہوا ہے۔

بے ثباتی کا کریں شکوہ کہاں
سر گیا، لیکن وہ سنگ در رہا

ناکام لوٹنے کا مجھے حوصلہ نہ تھا
طوفاں میں خود سفینہ ڈبونا پڑا مجھے

دم آنکھوں میں اٹکا ہے تو اب سوچ رہی ہوں
کچھ پاس مرے رخت سفر ہے کہ نہیں ہے

پھول کی سیج پر آتی نہیں کیوں نیند مجھے
لوگ تو کہتے ہیں سولی پہ بھی آجاتی ہے

نسرین نقاش نے اپنے شعری عمل میں مقصد اور حقائق کی ترجمانی میں سماجی، نفسیاتی اور فلسفیانہ تخلیقی عوامل سے بھی کام لیا ہے۔ اس طرح انھوں نے شعر کی زبان، شعر کی اندرونی وحدت اور واقعات کے اخراج جیسے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے فنکار کے منصب اور سیاسی، سماجی نیز مذہبی اور اخلاقی دباؤ کی بھی آئینہ داری کی ہے۔ شعر میں الفاظ کی اہمیت پر غور کرتے ہوئے وہ لفظ کی خوبصورتی اور بدصورتی کو اس کے اندر تلاش کرنے کی آرزومند نہیں ہیں بلکہ اپنے قدرت بیان پر زیادہ اعتماد کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اشعار خود مختار اور خود کفیل معلوم ہوتے ہیں۔ ان پر مصنف کی طبیعت کے جبر کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔

روز تصویر بنائے بھی، بگاڑے بھی وہی
ایسا لگتا ہے مصور مرا جذباتی ہے

ہم ہوئے بھی قتل تو احساس کی دہلیز پر
شہر میں موجود کتنے مقتلوں کے باوجود

اس سے پہلے کہ زمیں خاک بنادے مجھ کو
خاک سے تم مجھے نیزے پہ اٹھا لو یارو

ذراسی لغزش تمھیں شہادت کی برکتوں سے جدا نہ کردے
تم اپنے قاتل کو وقت آخر پیام حق بے حجاب کہنا

نسرین نقاش نے غزل کے علاوہ نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس میں انھوں نے وقتی احساس کو ترجمان بنانے کے ساتھ ساتھ اپنے اور اپنے قارئین کی جمالیاتی تسکین کے لیے غور وفکر اور اپنی تخلیقی ذہن کی اضطرابی کیفیتوں کے امتزاج سے ان داخلی تاثرات کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے جو مختلف سطحیں رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں میں اعلیٰ اور گہری بصیرت پیدا کرنے کے لیے جن خصوصی اور عمومی وسائل کی ضرورت محسوس کی، ان کو استعمال کیا اور اس طرح سے جو نظمیں تخلیق ہوئیں وہ نسرین نقاش کی نظمیں ہونے کی بھرپور گواہی دیتی ہیں۔ ان کی ایک نظم ''امن کے دیوتا'' ملاحظہ ہو۔

''ہماری آنکھیں
بینائی کھو چکی ہیں
کہ ہمارے عقائد کی دھند
اور حرص و ہوس کا دھواں
زمیں تا فلک
ہلاکت کا آسیب بن کر
ہمارے سامنے کھڑا ہے
اور ہم گھپ اندھیرے میں
اپنے ہی بدن کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں
اے امن کے دیوتا!
گرا دے یہ دیوار
جو ہم نے اپنے ہاتھوں خود کھڑی کی ہے
لوٹا دے ہمارا آسمان!
ہماری زبان!
ہمارا سورج!
ہمارا چاند
ہمارے تارے
لوٹا دے
سر سبز پہاڑیاں
ندیاں
اور جھیلیں
جہاں پرندے امن کے ترانے گاتے ہیں
اے دیوتا، ہمیں آشیرواد دے
کہ ہم اپنی عمارت سے
اینٹیں نہ نکالیں
اور امن کا سفید کبوتر

چھت کے منڈیر پر بیٹھا
اپنے پر سکھاتا رہے"

(امن کے دیوتا)

مندرجہ بالا نظم یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ نسرین نقاش نے وسیع اور بامقصد مطالعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سوچ، سمجھ کر اور سامنے کے موضوعات پر مستعمل نظموں میں روایتی لسانی خصوصیات اور مختلف وسیع امکانات کو پیش کیا ہے۔ ان کی ادبی معروضیت جدید ادب کی مشترکہ اقدار سے مل کر خواہ ان کا تعلق سیاست سے ہو، سماج سے ہو، فرد سے ہو یا نسوانی رومانی جذباتیت سے، ہر جگہ فنی تقاضوں کے آداب کو ملحوظ رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کا اس طور استعمال نہیں کیا ہے کہ بوجھل پن محسوس ہو اور نا قابل فہم ہو جائیں۔ ایک نظم "صلیب" ملاحظہ ہو۔

"کاٹ دو ہاتھ
سر قلم کر دو
میرے چہرے سے نوچ لو آنکھیں
کھینچ لو کھنچ سکے جو میری زباں
میری سانسوں میں
ڈال دو زنجیر
ہاں مگر!
اس سے قبل میں تم سے
صرف اتنا سوال پوچھوں گی
اپنے احساس کی صلیب سے تم
کیا فراموش کر سکو گے مجھے؟؟"

(صلیب)

نسرین نقاش کا ادبی سفر ابھی ان مراحل سے گذر رہا ہے جہاں بہت کچھ کرنے کے بعد بھی بہت کچھ کر گذرنے کی جستجو اور امکانات باقی رہتے ہیں۔ نسرین نقاش انھیں نئی اور انوکھی جستجوؤں کے سراغ میں سرگرم ہیں۔ اور اس سرگرمی پر غور کرتے ہوئے یہ توقع یقیناً کی جاسکتی ہے کہ ان کا وسیع فکری تخلیقی عمل اردو ادب کے سرمائے میں مزید اضافہ کرے گا۔

ان سب کے ساتھ نسرین نقاش کے اندر جو انکسارانہ جذبہ ہے اور خود احتسابی کا جو شعور ہے وہ بحیثیت ایک مصنف بھلے ذاتی طور پر زیادہ اہمیت کا حامل نہ ہو لیکن بحیثیت ایک انسان بڑی قدر کا حامل ہے۔ جبھی تو انھوں نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے۔

''نسرین ترے شعر بہت خوب ہیں لیکن
تجھ سے بھی بڑے شہر میں فنکار بہت ہیں''

(نسرین نقاش)

نمونۂ کلام

قرار جاں کے عوض دل کی وحشتیں بھی گئیں
جسموں کا لطف گیا غم کی لذتیں بھی گئیں

انا سے اس کی مری انکساری کیا ٹوٹی
کہ اس کے ساتھ ہی آپس کی نسبتیں بھی گئیں

ہمارا عشق عجب امتحان سے گذرا
کہ درمیاں سے دلوں کی رفاقتیں بھی گئیں

بچھڑتے وقت گلے مل کے روئے بھی لیکن
پھر ایسا بھولے کہ برسوں کی چاہتیں بھی گئیں

تھا فاصلہ تو تڑپتے تھے قربتوں کے لیے
قریب آئے تو ملنے کی فرصتیں بھی گئیں

دیار سنگ میں یوں دل کا آئینہ ٹوٹا
ہماری آنکھوں سے خوابوں کی جنتیں بھی گئیں

کچھ اس طریقے سے بدلا ہمارے گھر کا مزاج
ہمارے سر سے بزرگوں کی شفقتیں بھی گئیں

میں نے کیا جرم کیا ہے یہ بتائے کوئی
گھر جلے میرا، کہیں آگ لگائے کوئی
لائق ذوق میسر ہی نہیں دل کی چبھن
کچھ کڑی کر کے کماں تیر چلائے کوئی
سر ہتھیلی پہ لیے صبح سے پھر شام ہوئی
لے کے خنجر سر مقتل بھی تو آئے کوئی
آئینہ دیکھوں تو ہے سامنے صورت اس کی
اس طرح سے نہ کسی ذہن پہ چھائے کوئی
ہم تو جس رخ کے نمازی ہیں وہی رخ ہوگا
قبلہ و کعبہ نیا اپنا بنائے کوئی
کوئی چاہے تو وہاں چاہ بھلی ہوتی ہے
بے رسن چاہ میں خود کو نہ گرائے کوئی
شوق بیتاب ہو اور حسن ہو محتاط جہاں
دل کے تاروں کو قرینے سے ہلائے کوئی
بے وفا میں ہی سہی کون وفادار ہے یاں
داغ دل کتنے ہیں نسرین دکھائے کوئی

خود اپنا گھر بھی تری رہگذر میں چھوڑ چلے
ہم اپنا ذہن بھی دل بھی سفر میں چھوڑ چلے

ہم اس مکاں سے بہت دور آ گئے لیکن
عجیب آہٹیں دیوار و در میں چھوڑ چلے

ہم اپنی خاک اٹھا کر تو لے بھی آئے مگر
ہم اپنی روح کا غم تیرے گھر میں چھوڑ چلے

ہم آ گئے ہیں بہر حال بچ کے ساحل پر
ہم اس کو اس کی انا کے بھنور میں چھوڑ چلے

ہمارا فیصلہ کر دے گا بادباں نسرین
ہم اپنی ناؤ ہوا کے اثر میں چھوڑ چلے

جاگ اٹھا احساس کا وحشی درند
اڑ گئے گھر سے امنگوں کے پرند

مئے، خوشی، آنسو، لہو سب پی گئے
زندگی! ہم ہیں وہی رندوں کے رند

پیٹ بھرنا ہی مقدر ہے تو پھر
ہم کہاں انسان! ہم ٹھہرے چرند

کچھ دنوں سے آکے بیٹھا ہی نہیں
چھت پہ اس کی یاد کا ننھا پرند

اف وہ منظر! کانپ اٹھی نسرین میں
دشت ویراں، ایک ہرنی، سو درند

اگرچہ قول کا پکا بہت ہے
مگر اندر سے وہ ٹوٹا بہت ہے
وہ دہشت گرد کیا انساں نہیں ہے
اسے دنیا نے ٹھکرایا بہت ہے
وفا کے تپتے صحرا سے کسی کو
جو مل جائے تو اک قطرہ بہت ہے
مسلسل خط جو لکھتا ہے وہ مجھ کو
وہ اپنے شہر میں تنہا بہت ہے
وہ باشندہ ہے جانے کس جہاں کا
جسے دیکھا نہیں سوچا بہت ہے
محبت کرنے والوں کو بتا دو
یہ دریا ہر طرف گہرا بہت ہے
میں یوں تو آج بھی اس سے خفا ہوں
مگر میں نے اسے چاہا بہت ہے
ہوا بادل کا سینہ چھلنی چھلنی
کہ وہ پربت سے ٹکرایا بہت ہے
مری تکمیل کا نسرین اس کو
فقط اک لمحے کا وعدہ بہت ہے

دھواں دھواں سا وہ منظر ہمارے ساتھ رہا
تمام عمر جلا گھر ہمارے ساتھ رہا

ہم اپنی راہ پہ تھے، آپ اپنے رستے پر
وہی بچھڑنے کا منظر ہمارے ساتھ رہا

یہ اور بات کہ ہم بوند بوند کو ترسے
تمام عمر سمندر ہمارے ساتھ رہا

گماں گذرتا ہے کوئی ہمارے چہرے پر
خود اپنا چہرہ لگا کر ہمارے ساتھ رہا

کبھی ملا بھی تو دیکھا نہ اس نے بات ہی کی
قدم قدم جو برابر ہمارے ساتھ رہا

وہ کون تھا کہ جو سونی اجاڑ راہوں میں
کوئی چراغ جلا کر ہمارے ساتھ رہا

وہ اپنے شہر میں موجود رہ کے بھی نسرین
ہمارے شہر میں اکثر ہمارے ساتھ رہا

کیسے کیسے ضامن معیار لوگ
بن گئے بازار کا کردار لوگ
بحث کا عنواں ہوئے جب میرے عیب
کھل اٹھے اپنے فریبی یار لوگ
قتل، ڈاکہ، رہزنی، عصمت دری
پڑھتے پڑھتے تھک گئے اخبار لوگ
شام ڈھلتے ہی نہ جانے کیا ہوا
ہو گئے اچھے بھلے بیمار لوگ
مسخ چہروں کی نمائش گاہ میں
سج گئے ہیں وقت کے شہکار لوگ
جن کو کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں
ہیں وہی تو غازیٔ گفتار لوگ
ہوگئے ہیں خود پرستی کے شکار
زندگی کے در پہ خود آزار لوگ
رفتہ رفتہ ہم سے رخصت ہوگئے
شہر کے کیا کیا گل و گلزار لوگ

جاں تجھ پہ لٹا دینے کو تیار بہت ہیں
گویا تری بستی میں اداکار بہت ہیں
مانا ترے دنیا میں پرستار بہت ہیں
یہ بھی تو بتا ہم سے وفادار بہت ہیں؟
لمبی ہی سہی تیرے طلبگاروں کی فہرست
فنکار ہوں میرے بھی پرستار بہت ہیں
اے منزل ہستی تجھے میں پا نہ سکوں گی
رستے مری امید کے پرخار بہت ہیں
دیواروں میں چنوائے گئے پیار کی خاطر
اک ہم ہی نہیں ہم سے گنہگار بہت ہیں
اخلاص بھی اس دور میں خطرے کا نشاں ہے
اخلاص کے در پردہ ریاکار بہت ہیں
دل ٹوٹ بھی جائے گا تو غالب کی طرح ہم
لے آئیں گے بازار سے بازار بہت ہیں
غیروں سے محبت تو بہانہ ہے کہ ہم لوگ
خود اپنی پرستش میں گرفتار بہت ہیں
نسرین ترے شعر بہت خوب ہیں لیکن
تجھ سے بھی بڑے شہر میں فنکار بہت ہیں

خود کو بھی پرکھنے کا جگر ہے کہ نہیں ہے
دیکھیں گے کہ تو اہل نظر ہے کہ نہیں ہے
جو ہم پہ گذرتی ہے جدائی میں تمہاری
معلوم نہیں تم کو خبر ہے کہ نہیں ہے
برباد محبت ہوں ذرا یہ بھی تو دیکھوں
جو حال ادھر ہے وہ ادھر ہے کہ نہیں ہے
مانگا ہے خدا سے تمہیں اب دیکھنا یہ ہے
کچھ اپنی دعاؤں میں اثر ہے کہ نہیں ہے
دم آنکھوں میں اٹکا ہے تو اب سوچ رہی ہوں
کچھ پاس مرے رخت سفر ہے کہ نہیں ہے
ہر راستہ جاتا ہے ترے گھر کی ہی جانب
اس شہر میں میرا کوئی گھر ہے کہ نہیں ہے
اب تجھ سے جڑی ہے مری ہر راہ تصور
اب اور کوئی راہگذر ہے کہ نہیں ہے
نسرین سی معصوم کو رسوا کیا تونے
ظالم تجھے اللہ کا در ہے کہ نہیں ہے

کرم کو میرے ستم سمجھنا ستم کو بھی اک عذاب کہنا
تمہیں تو عادت سی ہوگئی ہے سمندروں کو سراب کہنا

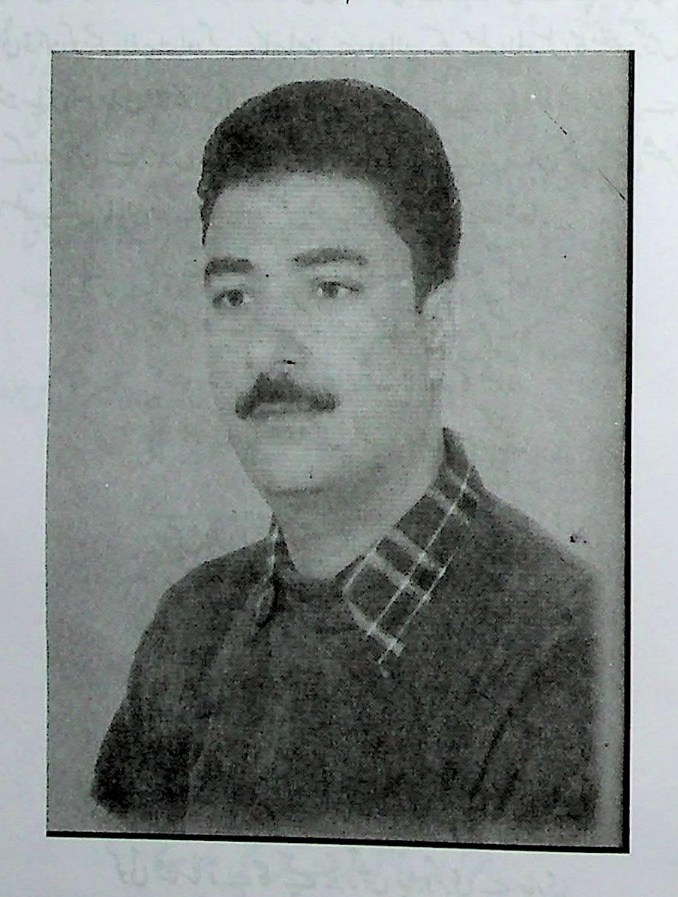
ورق ورق سے وہ ایک چہرہ تمہیں یہی اک پیام دے گا
کتاب ہستی کے پیچ و خم کو حیات کا آفتاب کہنا

نہ تم پہ کرتا تو کس پہ کرتا وہ نوک خنجر کی آزمائش
تم اپنے زخموں کے رنگ و بو کو بدن پہ اگتے گلاب کہنا

ذرا سی لغزش تمہیں شہادت کی برکتوں سے جدا نہ کردے
تم اپنے قاتل کو وقت آخر پیام حق بے حجاب کہنا

کہا ہے نسرین نے جو تم سے کہ تم سے ہرگز جدا نہ ہوگی
تم اس کے لطف و کرم کو لیکن مثال نقش بر آب کہنا

سلیم ساغر



اردو غزل کی نئی آواز۔ سلیم ساغر

سلیم ساغر نے اپنے اشعار میں ان موضوعات کو کثرت سے برتا ہے جن کا تعلق مادی زندگی کی فلاح و بہبود اور زمانۂ حاضر کے مسائل کی نشاندہی سے ہے۔ ان کے اپنے مخصوص معاشرے میں انسانی ذہن کو جس اذیت اور کرب کا سامنا ہے، وہ ان کے پہلے والی نسل کا مقصد نہیں تھا۔ اس لیے گذشتہ سیاسی اور سماجی عقائد ان کا بہت دور تک ساتھ نہیں دیتے۔ لہٰذا گذشتہ عقائد سے انحراف یا بغاوت کے درمیان سے انہوں نے اپنے کچھ عقائد دریافت کیے ہیں۔ ان میں بعض شعری عقائد احتجاجی اسلوب میں نمایاں ہوئے ہیں اور بعض طنزیہ پیرائے ہیں۔ چند اشعار۔

بارے ان کی رنجشیں بھی ایک احساں ہو گئیں
شام ہوتے جب کہ امیدیں پشیماں ہو گئیں
سخت سناٹا تھا، طے تھا رنگ لائے گا ضرور
ہاؤ ہو کی یہ صدائیں نغمۂ جاں ہو گئیں

ایک انجانا تخیل، ایک ان دیکھا سا خواب
محو حیرت ہے تمنا خواب کی تعبیر میں

میرے دل کی وسعتوں میں بھر دیا ذوق جمال
اور امکاں کی زمیں پھر کتنی بنجر دے گیا

کوئی شناسا رہے گا کیسے جو رقص جادوگری ہے جاری
سراب اندر سراب طینت ہزار چہرے بدلتے دیکھوں

سلیم ساغر زندہ، متحرک اور حقیقی شاعر ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۰ء کے آس پاس کے ابھرتے اور شناخت قائم کر چکے شعرا کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں ایسے استعارے اور علامتیں

موجود ہیں جنہوں نے شاعری کو نئی جہتوں سے آشنا کیا اور آگے کے امکانات کا سراغ لگایا ان کے یہاں ایسی شعری فضا ملتی ہے جو ان کے معاشرے کے منفرد غموں کے سامنے سپر ڈالنے کی بجائے ان کے تخلیقی ذہن کو مد مقابل آ کر احتجاج اور نبرد آزمائی کی کیفیتوں کو اشعار میں سمونے کی ترغیب دیتی ہیں۔ یہ کیفیتیں محض صوتی الفاظ کے ذریعہ ہی ظاہر نہیں ہوئی ہیں بلکہ اس کے لیے الفاظ کی مختلف شکلوں کو کام میں لایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے وہ سہل انگاری کے بجائے پیچیدہ بیانی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں لیکن پیچیدہ بیانی بیجا ابہام کا شکار نہیں ہو جاتی۔ ان کے اس شعری عمل سے برٹرینڈ رسل کے یہ جملے یاد آتے ہیں:

'اگر ہم صوتی الفاظ کے علاوہ کوئی اور لفظ استعمال نہیں کرتے تو یقیناً اس کی وجہ ہماری سہل انگاری ہے۔ ایک زبان بہروں اور گونگوں کی بھی ہے۔ ایک آدمی کا کندھے جھٹکانا بھی ایک طرح کا لفظ ہے۔ اگر معاشرہ اس پر متفق ہو جائے تو ہر وہ جسمانی حرکت جو خارجی طور پر نظر آ سکے لفظ بن سکتی ہے۔ لیکن ان سب کے مقابلے میں زبان کے اظہار کو جو فوقیت حاصل ہے، اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔'

(بحوالہ نئی شعری روایت، از شمیم حنفی، ص ۱۹۴)

خود فنا ہو جائے گا آخر حصار ذات میں
جو اٹھا کر رہ گزر سے نقش پا لے جائے گا
میرے ان احوال سے ہے ذات اس کی مشتہر
جو کرے گا ساتھ میرے، خود صلہ لے جائے گا

صلیب اپنی اٹھائے ہوں جب سے کاندھے پر
ملی نجات حیات و ممات سے مجھ کو

ہم کو اب آتش فرقت میں بھی جلنا ہوگا
ہم نے محبوب کے دامن کی ہوا پائی ہے

داستان عشق ہے یہ مختصر
سب گلابی لفظ نیلے ہو گئے

میکدے میں لاج میری رہ گئی
گھونٹ پانی کے نشیلے ہو گئے

سلیم ساغر نے اپنے اشعار میں کسی خاص پیغام یا مقصد کی تائید کے بجائے انسانی تجربات کی اس دنیا سے تعلق رکھا ہے جو فرد کی کامل آزادی کی خواہاں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اندرونی اور بیرونی ہم آہنگی جو کہ دنیاوی مسرتوں کی کلید ہے، پر کسی قسم کا کوئی جبر نہ ہو۔ لیکن زندگی کی بدلتی نوعیتوں نے ذہنی اور معاشرتی تقاضوں کی نوعتیں بھی تبدیل کر دی ہیں۔ اور یہ تبدیلی جاری و ساری ہے۔ زمانۂ حال کے آشوب اور اس سے وجود میں آنے والے وسوسوں سے نجات پانے اور ان سے آگاہ ہونے کے لیے اپنی تخلیقی توانائیوں اور جبلتوں کو احساس کی بھٹی میں جس قدر تپانا پڑتا ہے، سلیم ساغر کے اشعار اس کی نمائندہ مثالیں ہیں۔

مدعا تو لفظ کی تفصیل میں گم ہو گیا
ایک امکاں اپنی ہی تکمیل میں گم ہو گیا
ہر کسی نے ایک صورت دی جسے دیکھا نہ تھا
یوں ہوا چہرہ وہ پھر تمثیل میں گم ہو گیا

کدورت کا یہ لہجہ مختصر ہے
حیات جاوداں کی بات کر لیں

تھی یہ ڈگمگاتی کشتی، ہاں مگر یہ حال کب تھا
کہ اذیتوں بھرا ہے، جو سماں یہ ساحلوں کا
میں جہان رنگ و بو میں بے خبر سفر میں گم ہوں
یہ ہے ایک خود فریبی جو سفر ہے دائروں کا

سلیم ساغر کے کلام میں شائستگی، نفاست اور اس اعتبار سے کیف و اثر اور فنی رکھ رکھاؤ وغیرہ کو دیکھا جائے تو مایوسی تو نہیں ہوتی لیکن ان حوالوں سے تشنگی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ جو میری سمجھ میں آتی ہے، یہ کہ سلیم ساغر پیشہ ور شاعر نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ہمیشہ ور شاعر اپنے فن کو تقریباً تمام تر شعری موضوعات کو برتنے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔ اور سلیم ساغر کے یہاں معنوی وسعت کے باوجود موضوعاتی سطح پر ان کا اپنا اختصاصی ہے۔ ان میں شکست

خوردگی کی دھیمی دھیمی آنچ اور شدید غم بہت نمایاں ہے۔ یقیناً اردو کے لاتعداد شعرا کے یہاں یہ دونوں عناصر موجود ہیں۔لیکن بیش تر کے یہاں ان کی حیثیت لطف بیان کی ہے۔ سچی خواہشات کا کرب اور اس کی شدید کیفیات کا حقیقی بیان بہت کم شعرا کے یہاں پایا جاتا ہے۔سلیم ساغر کے اشعار بھی اس حقیقت نگاری کا آئینہ ہیں۔

آخر میں اس دیار کا حاصل ہے تشنگی
صحرائے زندگی میں تمنا سراب ہے

انتہائے شوق اپنی دیکھنے کی چیز ہے
اپنی حیرانی سے پانی کو بھی پتھر کر دیا

کس کا چہرہ ہے، خدا جانے لگائے ہے کون؟
کار دشوار ہے شیشوں کے نگر میں رہنا

ڈبو دے گا وہ امکانی جزیرے
دعا جو پانیوں کی مانگتا ہے

یہی نہیں کہ سب الفاظ کھو چکے تاثیر
بدلتے وقت میں ان کی صدا ہے خطرے میں

سلیم ساغر کے اشعار جذبات واحساسات کو براہ راست نہیں اکساتے بلکہ زندگی کی تلخیوں اور ناہمواریوں کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی حساسیت ان کی پوری نئی نسل کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ جدید علوم کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے والی اس نئی نسل کا المیہ یہ ہے کہ قدیم مذہبی اور روحانی وراثت کے تحفظ کی جس تلقین وترغیب کی وہ حقدار تھی، اسے اپنے پیش رؤں سے حاصل نہ ہو سکیں۔اس کی ایک وجہ شاید یہ ہو کہ پیش رؤں زمانے کی تبدیل ہوتی ہوئی صورت حال دیکھ کر یہ اندازہ کر بیٹھے کہ ہماری وراثت نئی دنیا کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو سکے گی۔یا پھر اپنی وراثت کے خانوں میں ان نئے تقاضوں کا پورا اترنا تقریباً ناممکن ہے۔لہٰذا ان دونوں میں سے ایک کے انتخاب میں ترجیح اسے ملنی چاہیے جو آئندہ زمانوں تک ساتھ دے سکے۔وجہ چاہے جو رہی ہو لیکن اس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ مادی ترقیات اور سائنسی فتوحال کے باوجود جن دوسری نارسائیوں اور ناآسودگیوں نے اپنے دامن کو دراز کیا انہیں سمیٹنا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ سلیم ساغر کے چند اشعار۔

ہر سو شعلہ زار لکھیں کیا؟
لاشوں کے انبار لکھیں کیا؟

خاموش سب ہوئے تو سماں بولنے لگے
منھ میں زبان رکھتے ہیں منظر تمام رات

جب سے الفاظ منافق ہوئے، پتھر دیا ہوں
کوئی آواز نہ آہنگ مری ذات میں ہے

تمہاری راہ میں کھڑی اصول کی صلیب ہے
کہ خود سے بچ سکوگے، یہ کمال کر نہ پاؤ گے

وہ توجہ ہے کہ محسوس ہو صحرا میں بہار
وہ تغافل ہے کہ گلشن میں بھی صحرا دیکھوں

سلیم ساغر کے یہاں وجودی فکر کے جو عناصر ملتے ہیں، وہ ذات کے اثبات کے علاوہ اس کی نفی کے اسباب بھی تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا تکلم ذاتی اظہار سے آگے جا کر آہنگ اور معنی کے اعتبار سے مختلف جہات اختیار کر لیتا ہے۔ بعض مقامات پر معنی کی ترسیل خیال اور تجربے کے دھندلکوں میں مدھم بھی معلوم ہوتی ہے لیکن شعور و ادراک کی روشنی میں جب یہ غبار چھنٹتا ہے تو کئی معنوی تہیں برآمد ہوتی ہیں۔ انہوں نے جذبات و خیالات کو تخلیقی منطق سے وابستہ کر کے شعری پیکروں کو بنایا اور سنوارا ہے۔ انہوں نے اپنے تخلیقی تجربات کو کسی مادی وقوعے کا پابند یا عکس محض نہیں بنایا ہے بلکہ جذبہ، احساس اور شعور کے انسلاک سے ایک ایسی شعری دنیا آباد کی ہے جو ان کے اہم اور معتبر تخلیق کار ہونے کی ضمانت دیتی ہے۔ دلیل کے طور پر چند اشعار پیش کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

ہے کربِ ذات کی دنیا بھی لفظیات میں گم
رہِ حیات میں عالم ہے شش جہات میں گم

ملا ہے ذات سے اپنی ترا سراغ مجھے
مگر میں آپ ہوا ہوں خود اپنی ذات میں گم

تیری شوخی ہے، ستم ہے کہ خدایا کیا ہے
اس سنگستان میں شیشے کا یہ پیکر دنیا

وہ جانتا ہے کہ آب حیات پی لے گا
کہ ذوق وشوق سے نیزوں پہ سر سجاتا ہے

اس پل مٹے کہ اس پل لہروں پہ منحصر ہے
ساحل کی ریت پر ہم تحریر ہو رہے ہیں

عجیب طرح کی بے چہرگی ہوئی حائل
جو اپنے آپ سے رشتہ کبھی بحال کیا

نمونۂ کلام

بارے ان کی رنجشیں بھی ایک احساں ہوگئیں
شام ہوتے جب کہ امیدیں پشیماں ہوگئیں
مسکرا کر دے گیا داغ جدائی خوش مزاج
موت کی دشوار تر راہیں بھی آساں ہوگئیں
شب سناتا ہی رہا میں داستاں در داستاں
بے سر و سامانیاں دن میں نمایاں ہوگئیں
میں نہ کہتا تھا کہ اتنی مت بڑھاؤ التفات
الفتیں اتنی بڑھیں آخر کہ احساں ہوگئیں
اے دل وحشی! تمہاری وحشتوں کی خیر ہو
جس قدر ویرانیاں تھیں تنگ داماں ہوگئیں
سخت سناٹا تھا طے تھا رنگ لائے گا ضرور
ہاؤ ہو کی یہ صدائیں نغمۂ جاں ہوگئیں
کیا سنائیں درد دل کی داستاں ساغر یہاں
زندگی کی صورتیں ساری پشیماں ہوگئیں

لفظ و معنی کیا ہیں وہ صوت و صدا لے جائے گا
وہ مجھے بے چہرگی دے گا سوا لے جائے گا
خود فنا ہو جائے گا آخر حصار ذات میں
جو اٹھا کر رہ گزر سے نقش پا لے جائے گا
اپنی بھی پہچان کھوئے گا یقیناً خود بخود
وہ مرے ہاتھوں سے جس دن آئنہ لے جائے گا
میرے ان احوال سے ہے ذات اس کی مشتہر
جو کرے گا ساتھ میرے، خود صلہ لے جائے گا
جو بڑھا تھا میری جانب کیا خبر تھی ایک دن
رنگت خون جگر دست حنا لے جائے گا
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں لکھا ہے دیکھنا
وہ مرے ہاتھوں سے اک دن سب اڑا لے جائے گا
اتنی سی میری تمنا رہ گئی ساغر یہاں
جانے کب وہ زندگی کا سلسلہ لے جائے گا

بادلوں کے جب وسیلے ہوگئے
سب نشان لمحوں میں گیلے ہوگئے
پھر بھی پیاسی رہ گئی تپتی زمین
غرق بستی کے قبیلے ہوگئے
لوگ کچھ ہیں مفلسی کا خواب ہیں
لوگ کچھ ہیں رنگ رنگیلے ہوگئے
داستان عشق ہے یہ مختصر
سب گلابی لفظ نیلے ہوگئے
میرے بالوں میں سفیدی آگئی
اور اس کے ہاتھ پیلے ہوگئے
میکدے میں لاج میری رہ گئی
گھونٹ پانی کے نشیلے ہوگئے
بات میں نے سچ کہی ساغر انہیں
اور حضرت لال پیلے ہوگئے

کہاں لے کے آ گیا ہے مجھے شوق خوشبوؤں کا
یہاں جسم و جاں میں بھی ہے جو گمان فاصلوں کا

تھی یہ ڈگمگاتی کشتی ہاں مگر یہ حال کب تھا
کہ اذیتوں بھرا ہے، جو سماں یہ ساحلوں کا

میری بے کسی کے عالم پہ نہ انگلیاں اٹھائے
یہ شباہتوں کا لشکر، یہ دیار آئینوں کا

میں جہان رنگ و بو میں بے خبر سفر میں گم ہوں
یہ ہے ایک خود فریبی جو سفر ہے دائروں کا

میں تلاش ذات کر لوں، میں رہ حیات کر لوں
مجھے کوئی تو پتہ دے میرے کھوئے سلسلوں کا

نہ حصار سرحدوں کا، نہ فصیل دشمنوں کی
میرے اس جہاں سے بہتر وہ جہاں ہے طائروں کا

رہ شوق ہے یہ ساغر تو سنبھل سنبھل کے چلنا
یہ ڈگر ہے مشکلوں کی، یہ سفر ہے حادثوں کا

دل کو اپنے بے نیاز لاؤ لشکر کر دیا
ہم فقیروں نے جہاں چاہا ہے لنگر کر دیا
حسن کی منت پذیری کب گوارا ہے ہمیں
دل کے بدلے جان دی ہے سب برابر کر دیا
انتہائے شوق اپنی دیکھنے کی چیز ہے
اپنی حیرانی سے پانی کو بھی پتھر کر دیا
پتھروں میں جان ڈالی اک نگاہ شوق نے
پھر غرور حسن نے ان کو ستم گر کر دیا
کیا کہیں حرف شکایت ہے خطاؤں میں شمار
خود ہی دیکھو نا کبھی کیا کیا مقدر کر دیا
خون سے میرے وہ ساغر رنگ کے سب بام و در
کہہ رہے ہیں ہم نے کیا رنگین منظر کر دیا

دل کا اس طرح تری راہ گزر میں رہنا
رنگ دکھلائے گا ہر وقت سفر میں رہنا

آتش عشق میں چپ چاپ جلا کرتے ہیں
اپنا دستور نہیں خبرو نظر میں رہنا

تو وہ خوشبو نہیں، جو موج ہوا لے جائے
تجھ پہ لازم ہے مرے قلب و جگر میں رہنا

کس کا چہرہ ہے، خدا جانے لگائے ہے کون؟
کار دشوار ہے شیشوں کے نگر میں رہنا

اب یہاں ہوتی ہے لاشوں کی تجارت ساغر
لازمی ٹھہرا ہے قاتل کی نظر میں رہنا

زمیں تا آسماں ہنگامہ سا ہے
تماشا زندگی کا سلسلہ ہے
پروں میں سر چھپائے ایک پنچھی
کئی پہروں سے بیٹھا کانپتا ہے
ڈبو دے گا وہ امکانی جزیرے
دعا جو پانیوں کی مانگتا ہے
چبھن کانٹوں کی شب بھر اس کی قسمت
جو لب پھولوں کے دن کو چومتا ہے
گماں آوارگی ہے جسم و جاں کی
یقیں سچ سلسلہ در سلسلہ ہے
جوانی ریگزاروں کی مسافر
حدی خواں دل ہے نغمہ گا رہا ہے
صدا آتی نہیں ہے کوئی ساغر
مرے اندر مگر کچھ ٹوٹتا ہے

ہر سو شعلہ زار لکھیں کیا؟
لاشوں کے انبار لکھیں کیا
شام سے وحشت سی رہتی ہے!
کل جانے اخبار لکھیں کیا؟
سب ہیں زندہ لاشیں لے کر
کیا کیا ہیں آزار لکھیں کیا؟
کس کس کو اب کھوج نکالیں؟
قبروں کے آثار لکھیں کیا؟
کس کی سفاکی کا مظہر
ابر شعلہ بار لکھیں کیا؟
صم بکم عمی ساغر
سارے ہیں کردار لکھیں کیا؟

میرے احساس کا کیا رنگ مری ذات میں ہے
خود سے ہی ایک عجب جنگ مری ذات میں ہے

جب سے الفاظ منافق ہوئے پتھرایا ہوں
کوئی آواز نہ آہنگ مری ذات میں ہے

کس کی سازش ہے لہو سے میرے تاثیر گئی
آج ہر نقش کہ بے رنگ مری ذات میں ہے

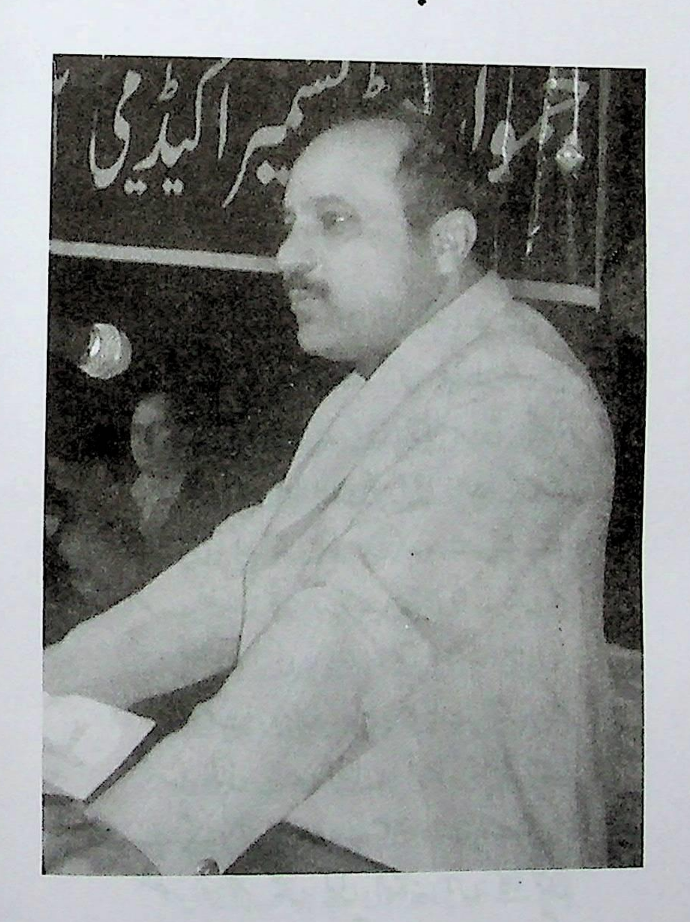
دوستی ٹھیک مگر بھولنے والے دیکھو!
اب بھی محفوظ ترا سنگ مری ذات میں ہے

ہاتھ لگتے ہی چمک کھوتی ہے ہر اک شئے کی
یا خدا! کیسا عجب زنگ مری ذات میں ہے

اس طرح عمر رواں دیکھ رہا ہوں ساغر
جیسے حسرت کہ بہ صد رنگ مری ذات میں ہے

ہے کرب ذات کی دنیا بھی لفظیات میں گم
رہ حیات میں عالم ہے شش جہات میں گم
ملا ہے ذات سے اپنی ترا سراغ مجھے!
مگر میں آپ ہوا ہوں خود اپنی ذات میں گم
میں اپنی آگ میں جلتا ہوں کب سے چپکے سے
مرے نصیب کا سورج ہے میری رات میں گم
چراغ راہ کی مانند جلتا بجھتا ہوں!
مرا جنات دہندہ ہے کائنات میں گم
مجسمہ خالی ہے انساں فرار مجرم ہے!
ہے رنگ ونسل میں، مذہب میں، ذات پات میں گم
شعور و فہم میں کوئی ٹھکانہ اس کا نہیں
تمام علم ہوا ہے قلم دوات میں گم
اسے ملوں میں کہ ساغر ابھی میں خود سے ملوں
وہ میری ذات میں گم ہے میں اس کی ذات میں گم

پرویز مانوس



پرویز مانوس کے تخلیقی اظہارات

اس میں کوئی شک نہیں کہ پرویز مانوس کے اشعار رومانی عشق ومحبت اور محبوب جو کہ جیتا جاگتا وجود رکھتا ہے، کے بیانات سے بھرے پڑے ہیں۔ یقیناً اس میں پرویز مانوس کی شاعرانہ طبیعت کے مختلف رویوں کا دخل ہے۔ ان مختلف رویوں میں جو شعری رویے مادی ترقی کے تصور کو اپنے زمانی پس منظر میں نمایاں کرتے ہیں، وہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ پرویز مانوس کا ذاتی معاشرہ اور خطہ جس کے ملک کے دیگر علاقوں سے چند مسائل بہت مختلف ہیں، مزید کرناک ہیں۔ جہاں جہاں پرویز مانوس نے ان مسائل کا اظہار اپنی تخلیق میں کیا ہے، وہاں وہاں ان کا شعری حسن مزید نکھر کر سامنے آیا ہے۔

یہ بستی خونچکاں ہونے لگی گر روز یونہی
ہنسیں گے بیٹھ کر آدم کی لاشوں پر، پرندے

صدائیں وحشیوں کی آرہی ہیں روح سے میری
میرے اندر بھی اگ آئے گا جنگل، دیکھتے رہنا

درندے جھانکتے ہیں جب کبھی غربت کی وادی میں
وہ چھپر میں جواں بیٹی چھپانا بھول جاتا ہے

جو شعاؤں کی قبا اوڑھ کے چلتے تھے کبھی
ساتھ میں سایۂ دیوار لیے پھرتے ہیں
آج بھی راہ محبت میں ترے خوش گزراں
اپنے شانوں پہ وہی دار لیے پھرتے ہیں

پرویز مانوس اپنے عہد کی تجدید پرستی جس میں سائنسی عقلیت سے وابستگی اور اس کے

ذریعے مادی ترقی کے باوجود انسانی قدروں کے اعتبار سے جو ایک حصار قائم ہو گیا ہے، اس پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں زمانے کی بہت زیادہ توجہ فوری مسائل کی جانب ہے۔ جبکہ زیادہ توجہ معاشرے کی تہہ میں چھپے ہوئے مسائل کی جانب ہونی چاہیے۔ فوری طور پر وجود میں آنے والے مسائل کے حل کے لیے جو صورتیں اختیار کی گئی ہیں، ان میں عجلت پسندی کا جو مظاہرہ کیا گیا ہے، وہ بھی 'نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم' کے عین مطابق ہے۔ پرویز مانوس کے نزدیک معاشرتی نظام اور اس میں زندگی گزارنے کے تقاضوں میں ذات کے داخل کو بھی وہی اہمیت ملنی چاہیے جو ذات کے خارج کو حاصل ہوتی ہے۔

لٹتے ارمانوں کا مٹھی میں لیے مال و متاع
ہم جہاں پھرتے ہیں، بازار لیے پھرتے ہیں
اپنی عظمت کے لیے میرے قبیلے والے
اپنے اجداد کی دستار لیے پھرتے ہیں

لہو کی بارشوں نے زہر کی فصلیں اگائی ہیں
مگر الزام تو اس گاؤں کے دہقاں پہ آیا ہے

میں نے اپنے دل میں سب کا درد بسایا یہ سن کر!
ڈال دیے قاتل نے خنجر، سارے میری جھولی میں
تہہ خانے والوں کو جانے کیوں امید ہے اک دن یہ
وحشت کا گھنگھور اندھیرا ڈھل جائے گا نئے افق پر

پرویز مانوس کے اشعار میں معاشرے کے جذباتی تقاضوں پر سماجی تقاضوں کے ترجیح پا جانے کے خلاف شدید احتجاج ملتا ہے۔ یہ احتجاج اپنی شدت کے باوجود کہیں تو نرم الفاظ میں ظاہر ہوا ہے اور کہیں قدر تلخ۔ پرویز مانوس معاشرے میں زندگی بسر کر رہے افراد کی جبلتوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں، ان کے حواس کے مطالبات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ وہ انسانی ذہن میں ذات کے داخل اور خارج کے باہم متضاد رویوں کے آئینے میں معاشرتی سچائیوں کے جبر کو تخلیقی سطح پر تسلیم نہیں کرتے اور اس کی عائد کردہ ذہنی شرطوں کی بالادستی انھیں بہت رنج پہنچاتی ہے۔ اس تعلق سے منطقی اثبات پسندی کا رجحان ان کے یہاں لسانی سطح پر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

برٹرینڈرسل نے لسانی اظہار کے چار بنیادی مسائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''سب سے پہلے یہ مسئلہ آتا ہے کہ جب ہم زبانوں کو کسی معنی کے اظہار کے ارادے سے استعمال کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں واقعتاً کیا وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ نفسیات کا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خیال، لفظ، جملے اور اس حقیقت کے مابینُ جس کا حوالہ یا اظہار مقصود ہوتا ہے، رشتے کی کیا نوعیت ہوتی ہے، یہ مسئلہ علم الوجود سے متعلق ہے۔ تیسرا مسئلہ جملوں کو استعمال کرنے کا ہے تا کہ سچ سامنے آئے نہ کہ جھوٹ۔ اس مسئلے کا تعلق اختصاصی علوم سے ہے جو زیر بحث جملوں کے مافیہہ سے ربط رکھتے ہیں۔ چوتھا مسئلہ اس سوال سے منسلک ہے کہ ایک واقعے کو (جیسے کہ ایک جملہ) دوسرے سے اس کی علامت کا اہل ہونے کے لیے کیا رشتہ قائم کرنا چاہیے۔''

(بحوالہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس از شمیم حنفی، ص ۱۵۹)

لسانی اظہار کے ان چار بنیادی مسائل کو اگر سوالات کی صورت میں دیکھا جائے تو اس کے جوابات پرویز مانوس کے اشعار میں موجود ہیں۔

بہت غرور پروں پر ہے جس پرندے کو
تم اس کے سامنے اونچی اڑان رکھ دینا

چاند کو چھونے کی ضد نے بدنام کیا
ہم نے تیرے نقش بنائے شاخوں پر

نفرت کا اپنے دل میں کوئی ناگ پال کر
اجداد کی زمیں کو نہ یوں خوں سے لال کر

دنیا کی اک فقیر نے کچھ یوں مثال دی
مٹھی میں لے کے خاک ہوا میں اچھال دی

ارزاں بہت ہے آج کے انسان کا لہو
وہ کون سی جگہ ہے جہاں یہ گرا نہ ہو

تعمیر آو ایسے کریں اب سماج کی
مندر میں مسجدوں میں جہاں فاصلہ نہ ہو

لشکر خوں تشنہ ہے اس شہر کے سر پر سوار
ہر قدم پر آپ کو اک نوحہ گر مل جائے گا

عقیدی کی طرح مت بانٹنا سورج کو خانوں میں
بکھر جائیں گی سب پرچھائیاں، کیا ہم نے کہتے تھے
جنوں میں لے کے ڈوبی ہے تمھیں اک سیپ کی خواہش
کبھی مت ناپنا گہرائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے
اگر اک باپ نے سب بیچ کر بیٹی بیاہی تو
سسک اٹھیں گی سب شہنائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے

پرویز مانوس نے اپنے اشعار میں زمانے کی لہک اور والہانہ پن کے سطحی مضمرات کو جگہ نہیں دی ہے۔ ادبی تخلیقات کے آئینے میں ان کی شخصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے زمانے کے انسان کی دشواریوں کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ایک ایسی نسل جس کے پاس ماضی کی شاندار روایت اور اپنے آباواجداد کی بہادری پر فخر کرنے کے تمام اسباب موجود ہوں اور پرانی تہذیب کی اعلیٰ اقدار کے خوشگوار اثرات ان کے خون میں شامل ہوں اور پھر زمانے کی طوالت کا اندازہ کرتے ہوئے اس کے اعتبار سے دم بھر لمحوں میں اس شاندار ماضی کے منظر کا بھوک، افلاس، بے روزگاری اور محرومی میں تبدیل ہو جانا ذہنی انتشار کی اس کیفیت کو جنم دیتا ہے، جس کی تہہ اندر تہہ مایوسی اپنے پورے شباب پر ہوتی ہے۔ پرویز مانوس کے اشعار میں اس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

شہر میں اندھوں کو آئینے دکھاتا کون ہے
بے در و دیوار کے یہ گھر بناتا کون ہے
اجنبی ہیں میں انھیں سمجھاؤں کیا اور کس طرح
بند دروازوں پہ آوازیں لگاتا کون ہے؟

سمجھ سکو تو یہی کہہ رہے ہیں سناٹے
ہر ایک شخص سماعت سمیٹ کر لائے

وہ جھونپڑا جو مکانوں میں رہ گیا گھر کر
ترس رہا ہے ہوا اور روشنی کے لیے

کبھی جن بستیوں میں دب چکے تھے راکھ کے شعلے
انہیں بھی فتنہ گر اک دن مذاہب کی ہوا دے گا

پرویز مانوس کی شاعری میں ایسے عناصر موجود ہیں جو انہیں الفاظ کی در و بست کے سلسلے میں ایک جذباتی نظام کے زیرِ سایہ تخلیق کار کی صورت میں بھی نمایاں کرتے ہیں۔ پرویز مانوس اپنے معاشرے کے محض تمدنی مسئلوں کی جانب ہی نظر نہیں کرتے۔اس طرح تو کسی بھی شاعر کا تخلیقی منظر نامہ بنیادی تمدنی عناصر کی شمولیت کے باوجود ادھورا معلوم ہوگا۔انھوں نے اپنے معاشرے اور داخلی تجربات کے حوالے سے ذات اور کائنات کا مشاہدہ تو کیا ہے لیکن اسے کسی طے شدہ فارمولے یا ہدایت کا آلۂ کار نہیں بنایا ہے۔ان کی نظر زندگی کے فنی اور فکری معیاروں کی تبدیلیوں پر بھی ہے۔اس طرح ان کی ذات کا آشوب اور ان کے عہد کا آشوب مل کر تخلیقی سطح پر ایک ایسی تیسری صورت ابھارتے ہیں جو سامنے کی الجھنوں اور پیچیدگیوں سے آگے بڑھتے ہوئے زمانی معلوم ہوتی ہیں۔

مندروں مسجدوں میں ٹکراؤ
دیکھ کر ٹوٹ جائے گا پتھر

آسمانوں سے اترتی آندھیوں! یہ سوچ لو
کیا اڑا لے جاؤ گی اب کیا ہمارے پاس ہے
رام کو تو آج بھی سونے میں تولے ہے سماج
اور سیتا کا مقدر آج بھی بن باس ہے

کھلا صیاد نے رکھا ہے پنجرا آج کے دن بھی
نہ جانے پھر بھی کیوں پنچھی رہا ہونے سے ڈرتا ہے

پرویز مانوس اپنے معاشرے میں تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے وقار کو برقرار رکھتے ہوئے عصرِ حاضر کے مفید امکانات سے ہم آہنگ کرنے کے خواہاں ہیں۔وہ سکون وضبط اور معروضیت جس سے ان کے معاشرے کا جدید دور محروم ہے۔اور اس بنیاد پر انھیں نئے زمانے کا معاشیاتی اور اقداری

آئینہ احساس شکست سے دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ نئے زمانے میں وہ سکت نہیں ہے کہ وہ نشیب وفراز کی اذیتوں کی راہوں کو ہموار کرتے ہوئے زندگی کی اس منزل پر پہنچ جائے جہاں سے زندگی کے مانیے، ایک کل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ جہاں رنج وغم کی دیواریں ہیں تو ان کو بھیدنے کے لیے نشاط کا آلۂ کار بھی موجود ہے۔ جہاں انسان کی ذہنی گرفت کائنات کی دوسری وسعتوں کو بھی قابو میں لے لیتی ہے۔ پرویز مانوس کے معاشرے میں کائنات کی وسعتوں کی یہ پرچھائیاں منتشر صورتوں میں دھندلکوں میں قید ہیں۔ اس لیے تہذیب واقدار کے چہرے مختلف پردوں میں ہیں۔

سمٹ جاتے ہیں بس اک چاپ سن کر ہی مکیں اپنے
کوئی معصوم بچہ بھی یہاں رونے سے ڈرتا ہے

سمجھ کر دھند جس کو آپ نے منظر سجائے ہیں
یقیناً وہ کسی مظلوم کے گھر کا دھواں ہوگا

توڑ کر میں اس قفس کو جب رہا ہوں جاؤں گا
پھر کسی مظلوم و بے کس کی صدا ہو جاؤں گا
لق ودق صحرا میں خود کو ڈھونڈنے نکلا ہوں میں
ایک دن میں ان کے ہونٹوں کی دعا ہو جاؤں گا

پرویز مانوس کے اب تک کے ادبی سفر اور تخلیقی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہان اردو میں ان کا مستقبل روشن ہے۔

نمونۂ کلام

آن گرے جب پنچھی کے پر، سارے میری جھولی میں
آئے پھر الزام کے پتھر، سارے میری جھولی میں
پہلے مجھ کو بھیج دیا دشمن سے لڑنے اس نے پھر
ڈال دیے کاغذ کے لشکر، سارے میری جھولی میں
چیخیں، آہیں، قہر، سلاسل، دہشت، زنداں، جلتے گھر
کرب زدہ لمحات کے منظر، سارے میری جھولی میں
میں نے اپنے دل میں سب کا درد بسایا یہ سن کر!
ڈال دیے قاتل نے خنجر، سارے میری جھولی میں
ترس رہی تھی جب یہ دھرتی قطرے کو اس وقت بھی تھے
اشکوں کے انگنت سمندر، سارے میری جھولی میں
روپ خدا کا دھار کے پتھر کور عقیدہ اگنی پتھ
خوف کے مارے آئے آزر، سارے میری جھولی میں
اپنی پیاس، خلش، رسوائی، درد، گھٹن، وحشت اور غم
اپنے ہاتھوں ڈال دے آکر، سارے میری جھولی میں

دکھا کے تیر فقط تم کمان رکھ دینا
ہدف بناؤ گے کس کو نشان رکھ دینا
بہت غرور پروں پر ہے جس پرندے کو
تم اس کے سامنے اونچی اڑان رکھ دینا
سمیٹ لاؤ جب یادوں کی راکھ دامن میں
تو گھر کے طاق میں پھر شمعدان رکھ دینا
کبھی تو کوئی مہاجر مکین بن جائے
کھلا اس غرض سے اپنا مکان رکھ دینا
مجھ نہ کاٹ یہ بولا ہے پیڑ بچوں سے
سمجھ کر اپنے بزرگوں کی شان رکھ دینا
سنائیں وقت کا نوحہ جسے پڑھ کر نسلیں
لہو سے لکھ کے کوئی داستان رکھ دینا
یہاں ہر شخص کے لہجے میں عجب تلخی ہے
سبھی کے منھ میں تم میٹھی زبان رکھ دینا

نفرت کا اپنے دل میں کوئی ناگ پال کر
اجداد کی زمیں کو نہ یوں خوں سے لال کر
اس نفرتوں کے دور میں ہے میری التجا
رکھنا محبتوں کی وراثت سنبھال کر
کیا ہوں میں، کون ہوں میں، ہے میرا مقام کیا؟
آ مجھ سے آج پھر وہ پرانے سوال کر
کوئی میرے رفیق سے پوچھو تو یہ سوال
کیا مل گیا اسے میری پگڑی اچھال کر
دعویٰ کیا تھا جس نے محافظ کے نام کا
وہ چل دیا ہے خواہش دل کو نکال کر
آماجگاہ شر ہے یہ دنیا نہیں ہے اب
رکھنا قدم فرشتوں! یہاں دیکھ بھال کر
منسوب تیرے نام سے ہو جائے تیرا شہر
قائم تو ایسی شہر میں اپنی مثال کر

لشکر خوں تشنہ ہے اس شہر کے سر پر سوار
ہر قدم پر آپ کو اک نوحہ گر مل جائے گا

کربلا کو اک زمانہ ہو گیا لیکن یہاں
آج بھی بہر و پیا بن کر شمر مل جائے گا

پھول، خوشبو، دلکشی، حسن و جوانی دیکھ کر
شاعری کرنے کا تم کو بھی ہنر مل جائے گا

عزم کا لے کر سہارا چل پڑو مانوس تم
راہ میں تم کو یقیناً ہی قمر مل جائے گا

نہ ایسے لیجیے انگڑائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے
بڑھیں گی اور بھی رسوائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے
نہ جاؤ چھوڑ کر یارو تم اپنے گاؤں کی مٹی
ملیں گی شہر میں تنہائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے
عقیدوں کی طرح مت بانٹنا سورج کو خانوں میں
بکھر جائیں گی سب پرچھائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے
بنانا راہنما اپنا کبھی مت کور چشموں کو
تمہیں کھا جائیں گی یہ کھائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے
جنوں میں لے کی ڈوبی ہے تمہیں اک سیپ کی خواہش
کبھی مت ناپنا گہرائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے
اگر اک باپ نے سب بیچ کر بیٹی بیاہی تو
سسک اٹھیں گی سب شہنائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے
تیری بستی کو نظر بد اگر مانوس لگ جائے
نہیں لکھ پاؤ گے چوپائیاں، کیا ہم نہ کہتے تھے

شہر میں اندھوں کو آئینے دکھاتا کون ہے؟
بے در و دیوار کے یہ گھر بناتا کون ہے؟
اجنبی ہیں میں انہیں سمجھاؤں کیا اور کس طرح
بند دروازوں پہ آوازیں لگاتا کون ہے؟
رات کی دہلیز پر تو چاند ابھی اترا نہیں
اتنی جلدی سے اجالوں کو بلاتا کون ہے؟
اس کی مجبوری ہے کیا یہ جانتے، تو جانتے
بھوکے بچوں کو چٹائی پر سلاتا کون ہے؟
دفعتاً یہ شہر ڈوبے گا اندھیرے خول میں
اپنی مٹھی میں یہ سورج کو چھپاتا کون ہے؟
سر پھری ہوتی ہیں لہریں کیا نہیں معلوم اسے
ریت پر ساحل کی تصویریں بناتا کون ہے؟
ایک مٹھی چھاؤں کو ترسو گے اک دن سوچ لو
آنگنوں سے پیڑ پودوں کو کٹاتا کون ہے؟
ہے بھروسہ دشمنوں کی ذات پر مجھ کو مگر
دوستوں کے بھیس میں خنجر چلاتا کون ہے؟
کون ہے دشمن چناروں کا ذرا ڈھونڈو سبھی
خشک پتوں کو یہ چنگاری دکھاتا کون ہے؟

مسافتوں میں یوں ہمت سمیٹ کر لائے
کہ جیسے مشت میں پربت سمیٹ کر لائے

رگوں میں خون شرافت کا جم گیا جب تو
فسادیوں سے حرارت سمیٹ کر لائے

شباب، حرص و ہوس آبرو کی منڈی میں
کہاں سے کوئی شرافت سمیٹ کر لائے

سمجھ سکو تو یہی کہہ رہے ہیں سناٹے
ہر ایک شخص سماعت سمیٹ کر لائے

کسی نے عقل سمیٹی کسی نے زر ہم تو
امیر شہر سے شہرت سمیٹ کر لائے

وفا، خلوص، مروت، امید کے بدلے
ہم اپنے شہر سے ہجرت سمیٹ کر لائے

وہ جس غریب کو روندا تھا رات آندھی نے
نہیں ہے اس میں سکت چھت سمیٹ کر لائے

جو روز خواب میں دیتا ہے تتلیاں ہم کو
اسے کہو کہ حقیقت سمیٹ کر لائے

سنا تھا سچ پہ وہ سنگسار کرتا ہے
جبھی تو ہم بھی جسارت سمیٹ کر لائے

کھلا صیاد نے رکھا ہے پنجرہ آج کے دن بھی
نہ جانے پھر بھی کیوں پنچھی رہا ہونے سے ڈرتا ہے

چناروں سے لپٹ بیٹھی ہیں پھر سے آگ کی لپٹیں
اب ان کی چھاؤں میں خود چاند بھی سونے سے ڈرتا ہے

ہمارے آنگنوں میں پھر سمندر ہے عذابوں کا
کوئی بھی آستیں اپنی یہاں دھونے سے ڈرتا ہے

صلیبوں کو عطا کی لازوال اک زندگی جس نے
وہی اب جسم کو اپنے یہاں کھونے سے ڈرتا ہے

جو رہتا ہے مہاجر کے مکاں میں ایک مدت سے
وہی اس شہر میں اب بے مکاں ہونے سے ڈرتا ہے

سمٹ جاتے ہیں بس اک چاپ سن کر ہی مکیں اتنے
کوئی معصوم بچہ بھی یہاں رونے سے ڈرتا ہے

گلے میں سانپ ڈالے کو بہ کو پھرتا ہے اک سادھو؟
وہ کرب ذات کا اک بوجھ یاں ڈھونے سے ڈرتا ہے

حسینی قافلے کا واقعہ جب بھی بیاں ہوگا
مرا زخمی قلم مظلومیت کا ترجماں ہوگا

ابھی سب کے لبوں پر ہیں میرے اشعار لیکن کل
ورق اک اک صحیفے کا میری ہی داستاں ہوگا

سمجھ کر دھند جس کو آپ نے منظر سجائے ہیں
یقیناً وہ کسی مظلوم کے گھر کا دھواں ہوگا

پگھل جائے گی رشتوں کی یہ سل اک دن مگر پھر بھی
یہ پانی بن کے یادیں دل کے دریا میں رواں ہوگا

یہ خوشبو، دھوپ، شبنم، رنگ، موسم، کہکشاں سب کچھ
سمٹ کر حسن بنا جائیں گے جب تک وہ جواں ہوگا

اندھیری رات میں مفلس کوئی جب چاند دیکھے گا
تڑپ اٹھے گا بھوکا اس کو روٹی کا گماں ہوگا

خلاؤں میں بھٹکتا اک پرندہ سوچتا ہے یہ
لہو کے شہر میں کس چھت پہ اس کا آشیاں ہوگا

توڑ کر میں اس قفس کو جب رہا ہوں جاؤں گا
پھر کسی مظلوم و بے بس کی صدا ہو جاؤں گا

میں یہ سورج سے کروں گا گفتگو پچھلے پہر
دو پہر کی دھوپ میں اب میں کھڑا ہو جاؤں گا

چاندنی سے کھیلتے تجھ کو اگر میں دیکھ لوں
پھر تری دہلیز کا میں بھی دیا ہو جاؤں گا

لق و دق صحرا میں خود کو ڈھونڈنے نکلا ہوں میں
ایک دن میں ان کے ہونٹوں کی دعا ہو جاؤں گا

ذات کا اپنی تحفظ کر نہ پاؤں میں اگر
ایک قطرے کی طرح میں بھی فنا ہو جاؤں گا

نے مجھے ص
چھ جلدوں
ست جموں
ال (۲)
ساتھ ہی ک
ہر کے چند
ور یہ موا
کے۔
وران ج
ذیر آزا
نے کتاب
ا، رفیق
بتائی جو
تصویر،
منتخب ک
ں صاحب
سر ورق
بے حد ممن